Regd. L. No.7243 Phone.80860

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1975

اس پرچہ میں

پرویز صاحب کا بصیرت افروز خطاب

وہ ہمارا خواب تھا ——

—— یہ خواب کی تعبیر ہے

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور ۱۱

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ [illegible] پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ۱۸ روپے غیر ممالک ۲ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۲۸	دسمبر ۱۹۷۵ء	شمارہ ۱۲

فہرست

مختصر روئیداد طلوعِ اسلام کنونشن ... (مرتبہ چوہدری عبدالعزیز ایم اے) ۲
نظریاتی اسلامی مملکت ..... (پروفیسر علاؤالدین اخگر) ۱۱
تفہیم القرآن کے حوالوں کی تصحیح ۱۶
ہماری جمہوریت کے استحصالی انداز ..... (ڈاکٹر صلاح الدین اکبر) ۱۷
مطالب الفرقان ۳۱
وہ ہمارا خواب تھا ... یہ خواب کی تعبیر ہے۔ (محترم پرویز صاحب کا طلوعِ اسلام کنونشن پر خطاب) ۳۳

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

مرتبہ:۔ چوہدری عبدالعزیز ایم اے

مختصر روئیداد طلوعِ اسلام کنونشن

(منعقدہ ۲۳ تا ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

آج ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۵ء جمعرات کا دن ہے اور میں اپنے دیگر رفقائے قافلۂ قرآنی کی معیت میں اس اجتماع میں شرکت کے لئے فکرِ قرآنی کے مرکز واقع ۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور میں پہنچ گیا ہوں جس کا ہمیں سال بھر شدت سے انتظار رہتا ہے۔ مرکز کے بالمقابل سبزہ زار میں ایک نہایت وسیع و عریض پنڈال دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا پُر بہار منظر لئے ایستادہ ہے۔ سب سے پہلے اصحابِ صفہ کے رنگ میں رنگے ہوئے پیکرِ صدق و صفا اور مجسمۂ خلوص و عمل شیخ عبدالحمید صاحب پر نظر پڑی، جو اپنی سابقہ روایات کو تازہ کرتے ہوئے بک سٹال پر لٹریچر کی ترتیب میں منہمک دکھائی دیئے۔ حسبِ معمول نہایت گرم جوشی اور مسرت سے بغل گیر ہوئے۔ اسٹال پر ان کے جذب و انہماک سے یوں دکھائی دیتا تھا گویا وہ این و آں سے بے خبر اسی گوشہ پر تمام توجہات کو مرکوز کئے ہوئے ہیں۔ لیکن پہلے ہی سوال کے جواب میں یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آگئی کہ ان کی نگاہ کنونشن سے متعلق جملہ انتظامات و اہتمامات کے ایک ایک جزو پر ہے۔ صدر دروازہ کے اندر استقبالیہ میں خواجہ اظہر عباس صاحب تشریف فرما ہیں۔ جن کے متعلق بے ساختہ کہا جا سکتا ہے کہ ــــ نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو ــــ نہایت خندہ جبینی سے خوش آمدید کہا۔ اپنے ریکارڈ کو دیکھا اور ہمارے قیام و طعام اور دیگر سہولیات سے متعلق پوری پوری معلومات بہم پہنچا دیں۔ حسبِ سابق قریب دو صد مہمانوں کے قیام و طعام وغیرہ کا انتظام مفکرِ قرآن کی رہائش گاہ اور اس سے ملحق، ان کے قدیم ترین رفیقِ محترم شیخ سراج الحق صاحب کے بنگلہ میں کیا گیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ شرکاء کنونشن کی صف میں ہم السابقون الاولون میں سے ہیں۔ لیکن آگے جا کر معلوم ہوا کہ بزمِ کراچی اور بزمِ کوئٹہ کے احباب طائرانِ پیش رس کی طرح ۲۲ اکتوبر ہی کو تشریف لے آئے ہیں۔ جس طرح سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک ملا کرتے ہیں اسی حسنِ تبسم اور دلکشائی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملاقی ہوئے۔ اپنی قیام گاہ میں سامانِ سفر رکھا ہی تھا کہ بزم ہائے طلوعِ اسلام کے نمائندگان کے ابتدائی اجلاس کے لئے بزمِ لاہور کے نمائندہ محترم سراج منیر صاحب، جنہیں کنونشن کے مہمانوں کی

میزبانی کا شرف بھی حاصل ہے، کا ہلاوا آ گیا۔ اس اجلاس میں کنونشن کے تفصیلی پروگرام کو سامنے لایا گیا۔ اور مجوزہ تجاویز و تدابیر پر بھی ایک نگاہ ڈالی گئی۔

جمعرات ۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۵ء بوقت چھ بجے شام

(پہلا کھلا اجلاس)

صدارت :۔ محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب ایڈووکیٹ۔ ساہیوال۔

تلاوتِ قرآنِ کریم :۔ حافظ عبدالمجید صاحب۔

پیامِ اقبالؒ :۔ مرزا محمد خلیل صاحب۔

یہ اجلاس مفکرِ قرآن جناب پرویز کے استقبالیہ کے لئے مخصوص تھا۔ انفلوئنزا کے حملہ کی وجہ سے وہ نسبتاً کمزور نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ اپنی بے پناہ قوتِ ارادی اور قرآن سے بیکراں جذب و شوق کی بنا پر اس قسم کی طبیعی نقاہتوں کو مقصدِ پیشِ نظر کی سرانجام دہی پر غالب نہیں آنے دیا کرتے۔ وہ حسبِ سابق ایک تبسمِ جاں نواز لبوں پر لئے اور روح پرور جذبۂ مسرت کے ساتھ احباب کے ہدیۂ اسلام کا مخلصانہ جواب دیتے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ اگرچہ یہ کنونشن کا پہلا اجلاس تھا اور مخصوص بھی استقبالیہ کے لئے تھا۔ لیکن پنڈال سامعین کی کثرت سے اپنی تنگ دامانی کا شکوہ سنج تھا۔ پرویز صاحب کے قریب اڑھائی تین گھنٹہ پر پھیلے ہوئے اس خطاب کو سامعین نے اس جذب و انہماک سے سنا کہ کہیں سے کسی کے کھانسنے تک کی آواز بھی سمع خراش نہ ہوئی۔ طلوعِ اسلام کے اجتماعات کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ یہ نہایت پُروقار، سنجیدہ، متین اور باعظمت ہوتے ہیں۔ یہ خطاب طلوعِ اسلام کی نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے اس لئے اس پر کسی تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نظر نہیں آتی۔

جمعرات ۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۵ء ½ ۹ بجے شام

(بزموں کا خصوصی اجلاس)

صدارت :۔ محترم قدیر احمد خان صاحب نمائندہ بزم طلوعِ اسلام۔ کوئٹہ

تلاوتِ قرآنِ کریم :۔ جناب ظہیر الدین صاحب (کوئٹہ)

کلامِ اقبالؒ :۔ مرزا محمد خلیل صاحب

اس اجلاس میں سب سے پہلے کنونشن کے میزبان محترم سراج منیر صاحب نے مہمانوں کا استقبال کیا، اور اس کے بعد ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام کی مرتب کردہ رپورٹ کو بزموں کے سامنے پیش کیا۔ اس رپورٹ میں ادارہ کی مختلف شعبوں میں کارگذاری اور بزموں کی طرف سے تعاون کی تفصیلات

اعداد و شمار کے ساتھ پیش کی گئی تھیں۔ یہ ہیئتِ مجموعی حقیقت یہ سامنے آئی کہ طلوعِ اسلام کی یہ قرآنی تحریک اب دور دور تک پھیل رہی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے شائع کردہ لٹریچر کی مانگ اتنی بڑھ گئی ہے کہ ادارہ کے موجودہ وسائل اُسے کماحقہٗ پورا نہیں کر پاتے۔ بنا بریں اس اجلاس اور اس کے بعد کے خصوصی اجتماعات میں مرکزی توجہ اس نکتہ پر دی جاتی رہی کہ اِس فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ کو وسیع تر کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کی جائیں۔ قریب گیارہ بجے شب یہ خصوصی اجلاس ختم ہوا اور اس کے بعد مہمان گاہوں میں چلے گئے۔ (جنہیں خواب گاہیں نہیں، بلکہ قیام گاہیں کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ شرکائے کنونشن راتوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ بھی قرآنی تذکارِ جلیلہ کے لئے وقف کئے ہوتے ہیں اور بہت کم وقت کے لئے استراحت فرماتے ہیں۔)

بزمِ کراچی کی حسین و جمیل پیش کش

بزمِ کراچی کو شروع ہی سے یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ ہر سال کنونشن کے موقعہ پر اپنا منفرد اسٹال نصب کرتی ہے جس میں وہ تحریک کے تعارف، محسنینِ انسانیت کے کردار و سیرت اور فکری سعی و کاوش کی تفاصیل اور قرآنی اقدار و اصول کی تشریحات پر مشتمل نہایت حسین و جمیل انداز سے نمائش ترتیب دیتے ہیں۔ یہ سب جنت بداماں، مرصع کاریوں کا سلسلہ بزم کے نحیف و نزار لیکن جواں بخت و جواں ہمت نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب کی زیرِ قیادت ارکانِ بزم کے حسنِ تعاون کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ امسال انہوں نے اِس نمائش کو اِس قدر وسیع اور جاذب پیمانے پر ترتیب دیا تھا کہ یہ سابقہ نمائشوں پر فوقیت حاصل کر گئی۔ کھلے اجلاس کے اختتام پر مفکرِ قرآن نے بصد ذوق و شوق اس کا افتتاح فرمایا اور بارگاہِ ایزدی میں سجدۂ شکر کے بعد اِن احباب کے ذوق و ولولہ اور صدق و خلوص میں برکت و افزائش کے لئے نہایت دلگدازی سے بہ چشمِ نم دعا مانگی۔ اس نمائش میں پاکستان کے معمارِ اوّل سرسید علیہ الرحمۃ، پیامبرِ پاکستان علامہ اقبالؒ، بانیٔ پاکستان قائدِ اعظمؒ اور مفکرِ قرآن جنابِ پرویز کے قابلِ رشک کارناموں کو مرقع شکل میں آویزاں کیا گیا تھا۔ ناظرین اس سے بڑے متاثر ہوئے اور کنونشن کے چاروں دن یہ نمائش عوام و خواص کی خصوصی توجہ کا مرکز بنی رہی۔

جمعہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۵ء - ۹ بجے صبح
(بزمول کا خصوصی اجلاس)

صدارت :- محترم محمد اسلام صاحب نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کراچی
تلاوتِ قرآنِ کریم :- حافظ عبدالمجید صاحب
کلامِ اقبالؒ :- مرزا محمد خلیل صاحب

سابقہ خصوصی اجلاس میں قرآنی فکر کی وسیع تر نشر و اشاعت کے لئے جو تجاویز زیرِ غور آئی تھیں، اِس

اجلاس میں اُنہیں عملی پیکر عطا کرنے کے لئے ضروری تدابیر زیرِ غور آئیں۔ پرویز صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ جب میں اپنے ان رفقائے قافلہ کی بے سروسامانی اور تنگ دامانی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو میرا دل بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہی درویشانِ بے کلاہ تحریک کے سلسلہ میں ہر مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے کس جذبۂ بے اختیارِ شوق سے لبیک کہتے ہیں تو اس سے میری رگوں میں تازہ خونِ حیات دوڑنے لگتا ہے۔ اس اجلاس میں اسی ولولۂ شوق کا منظرِ حیات بخش ظہور میں آیا اور جملہ اراکین نے پیشِ نظر تجاویز کو کامیاب بنانے کے لئے پورے پورے تعاون کا ثبوت دیا۔

جمعہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲½ بجے بعد نمازِ جمعہ

(دوسرا کھلا اجلاس)

صدارت:۔ ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب۔ لائل پور

تلاوت قرآن کریم:۔ محمد اکرم راٹھور صاحب (کراچی)

کلامِ اقبال:۔ مرزا احمد خلیل صاحب

یہ اجلاس مختلف اربابِ فکر و نظر کے ان مقالات کے لئے مخصوص تھا جو انھوں نے اس کنونشن کے لئے مرتب فرمائے تھے۔ سب سے پہلے چوہدری عطاء اللہ صاحب ایڈووکیٹ ساہیوال نے اپنا مقالہ پیش فرمایا جس کا عنوان تھا۔ "منزل ہے کہاں تیری!" چوہدری صاحب کا انداز نہایت حسین اور سادہ ہوتا ہے، لیکن اس میں پُرخلوص طنز و تنقید کے تند و تیز نشتر اِس قسم کے حیدی پردوں میں ملفوف ہوتے ہیں کہ جو دل میں کھٹک تو پیدا کریں، لیکن ان سے جسموں پر کہیں خراش نہ آئے۔ انھوں نے نہایت دلگذار انداز میں بتایا کہ کاروانِ پاکستان کچھ ایسی غلط راہوں پر چل نکلا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب یہ کہاں جا کر دم لے گا۔ لیکن چونکہ چوہدری صاحب قرآنی نقوش کو اپنے دل کی گہرائیوں میں لئے ہوئے ہیں، اس لئے وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے اور انتہائی تاریکیوں میں بھی کشادگی کی راہ سامنے لے آتے ہیں۔ جب یہ مقالہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوگا تو وہ ہمارے اس تبصرہ کی شہادت خود پیش کر دے گا۔

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر اب حلقۂ طلوعِ اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہر کنونشن میں اُن کا مقالہ خصوصی تحسین کا مرکز اور عام شہرت کا موجب ہوتا ہے۔ معالج تو وہ جسمانی بیماریوں کے ہیں۔ لیکن انفرادی اور اجتماعی، نفسیاتی عوارض پر بھی ان کی نگاہ بڑی غائر، تشخیص نہایت ماہرانہ اور علاج بڑا مشفقانہ ہوتا ہے۔ امسال اپنے خطاب میں انھوں نے مغربی جمہوریت کی اور وہ تباہیوں اور ناکامیوں کا تجزیہ نہایت دقتِ نظر سے کیا اور یہ بتایا کہ اس کا بنیادی سبب ووٹ کا غلط استعمال ہے۔ انھوں نے بات تنقید تک ہی نہیں چھوڑی، بلکہ یہ بھی بتایا کہ اس کا صحیح استعمال کس طرح ہو

ہو سکتا ہے اور اس سے کس طرح نہایت خوش آئند نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ یہ مقالہ بھی طلوعِ اسلام میں شائع ہوگا، تو اس کی تفصیلات اپنی افادی حیثیت کی آپ شاہد ہوں گی۔

اور آخر میں ملک کے مشہور تنقید نگار محترم محمد اسلام صاحب (نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی) اسٹیج پر تشریف لائے۔ یوں تو اسلام صاحب کی نگاہِ ذرہ رس زندگی کے ہر گوشہ میں اشیاء کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش میں سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ لیکن مودودیت کا مطالعہ ان کا خصوصی موضوع ہے۔ اس سال انہوں نے مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی لیکن اس میں ایسے ایسے گوشوں کو ابھار کر سامنے لائے جن سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مودودی صاحب کس طرح اسلام کو مسخ صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور اس کے نتائج کس قدر تشویش انگیز اور تباہ کن۔ ان کا یہ تبصرہ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔ (سہوِ کتابت سے اس مقالہ میں تفہیم القرآن کے حوالوں میں کچھ ابہام سا رہ گیا تھا جسے اس اشاعت میں واضح کر دیا گیا ہے۔)

جمعہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۵ء ۶ بجے شام

(تیسرا کھلا اجلاس)

مجلسِ استفسارات

طلوعِ اسلام کنونشن کی یہ روایت آغازِ سفر ہی سے مسلسل چلی آ رہی ہے کہ ایک خصوصی مجلس میں بانیٔ تحریک جناب پرویز صاحب زندگی کے اہم مسائل سے متعلق سامعین کے سوالات کے جوابات اپنی بصیرت کے مطابق قرآنی روشنی میں دیتے ہیں۔ یہ جوابات جہاں حقائق و معارف کی ایک دُنیا اپنے جلو میں لئے ہوتے ہیں تو وہاں ان کے پیش کرنے کا انداز ایسا شگفتہ اور بشاش ہوتا ہے کہ ان کی ہر بات دل کی گہرائیوں تک میں اتر جاتی ہے۔ ان استفسارات اور جوابات کی تفصیل نہ پہلے کبھی ضبطِ تحریر میں لائی جا سکی ہے، نہ اب ہی اس کا امکان ہے۔ اس کے متعلق تو اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ —— کیفِ ایں بادہ نہ دانی بہ خدا تا نچشی —— یہ تو سُننے ہی سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اربابِ شوق کو سال بھر اس محفل کا نہایت شدّت سے انتظار رہتا ہے۔ کامل تین گھنٹوں تک یہ مجلس منعقد رہی اور اس وقت کے گزرنے کا کسی کو احساس تک نہ ہوا۔

ہفتہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۵ء ۱۰ بجے صبح

(بزموں کا خصوصی اجلاس)

صدارت:۔ حکیم قمرالنساں ثقلینی صاحب (رحلہ جیم)

تلاوتِ قرآن کریم :- ظہیر الدین صاحب (کوئٹہ)
کلامِ اقبالؒ :- محمد اکرم راٹھور (کراچی)

بزموں کا یہ خصوصی اجلاس اُس ایجنڈا کی تکمیل کے لئے منعقد ہوا، جو گذشتہ روز باقی رہ گیا تھا۔ اس میں بھی احباب نے اُسی گرم جوشی اور حسنِ تعاون کا ثبوت دیا جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے جو کہا ہے کہ قرآن کریم سے دلوں کے رشتے باہمد گر پیوست ہو جاتے ہیں، تو اس کا محسوس ثبوت کنونشن کے یہ اجتماعات بہم پہنچاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرکائے محفل کی طبائع میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ بعض امور پر اُن کی آراء بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اُن پر بحث و تمحیص اور اظہارِ خیالات کی پوری پوری آزادی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود، کہا مجال، کہیں ذرا سی بھی کدورت پیدا ہو جائے یا کسی کی پیشانی پر بل کے آثار تک بھی دکھائی دے جائیں۔ اس قسم کے ائتلافِ قلبی کا نظارہ اور کہیں کم دیکھنے میں آیا ہوگا۔ نصب العین کی وحدت اور اس کے حصول کے لئے خلوصِ نیت کا ایسا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔

ہفتہ ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲ بجے بعد دوپہر
(چوتھا کھلا اجلاس)

بزمِ مذاکرہ

علامہ اقبالؒ نے یہ دعا مانگی تھی کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

حضرتِ علامہ کو یہ شاہیں بچے ملے یا نہیں، لیکن ہمارے مفکرِ قرآن خوش قسمت ہیں کہ انہیں یہ شاہیں بچے ملے اور اُن کی فکری تربیت سے انہیں بال و پر بھی میسر آ گئے۔ چنانچہ ان میں سے اکثر ملک، بلکہ بیرونِ ملک کی علمی اور فکری فضاؤں میں مصروفِ پرواز ہیں اور قرآنی نورِ بصیرت کے عام کرنے میں محوِ تگ و تاز۔ اِن کی اسی فکری تربیت کی ایک کڑی طلوعِ اسلام کنونشن کا مذاکرہ بھی ہے۔ اس کا آغاز ۱۹۶۱ء میں ہوا تھا، جس میں چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیوں نے حصہ لیا تھا۔ ان میں سے اکثر اب تعلیم سے فارغ ہو کر عملی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن مذاکرہ کے ساتھ ان کی وابستگی بدستور جاری ہے۔ اِس مجلس میں ہر سال نئے نئے شاہیں بچوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ عمر کے لحاظ سے تو وہ بچے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ ——— جوانوں کو پیروں کا استاد کر ——— باتیں وہ بڑے بڑے سیانوں سے بھی بلند اور بالا کرتے ہیں۔

امسال اِس مذاکرہ کی پہلی نشست کا آغاز دو بجے بعد دوپہر ہوا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اِس

سے لگائیے کہ اس میں اسٹیج سیکرٹری کے فرائض خود مفکرِ قرآن سرانجام دیتے ہیں۔ اس سے ایک تو یہ محفل بڑی باعظمت اور پُروقار ہو جاتی ہے اور دوسرے بچوں کے سر پر ان کا دستِ عاطفت اور پھر ان کی حوصلہ افزائی کے مشفقانہ الفاظ ان میں عجیب جرأت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس نشست کی صدارت بالعموم کسی محترمہ خاتون کے حصہ میں آتی ہے۔ اس سال اس میں ایک خاص خصوصیت پیدا ہو گئی۔ محترمہ مسز رابعہ ڈار، بنیادی طور پر تو پاکستان کی رہنے والی ہیں، لیکن عرصۂ دراز سے لندن میں مقیم ہیں۔ انہوں نے وہیں پرویز صاحب کی قرآنی فکر کا مطالعہ شروع کیا اور قریب سترہ سال سے ان کا یہ ذوق اور انہماک جاری ہے۔ اس سے آپ ان کی قرآنی بصیرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ امسال وہ عین کنونشن کے قریب پاکستان تشریف لائیں اور مذاکرہ کی پہلی نشست کی مسندِ صدارت انہی کو پیش کی گئی۔ حسبِ معمول محترمہ ثریا عندلیب نے نہایت وجد و کیف کے عالم میں قرآنِ کریم کی تلاوت کی اور متعلقہ آیات کا مفہوم بیان کیا، اور پھر مذاکرہ کا آغاز چھوٹے چھوٹے بچوں سے کیا گیا۔ پانچ بجے کے قریب نمازِ مغرب کے لئے وقفہ ہوا۔ چھ بجے دوسری نشست شروع ہوئی۔ اس کا آغاز محترم پروفیسر علاؤالدین اختر چیئرمین بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن پنجاب کے گرانقدر مقالہ سے ہوا۔ اختر صاحب اس سے پہلے بھی دو کنونشنوں میں اپنے بصیرت افروز مقالات پیش کر چکے ہیں۔ ان کی نگاہ بڑی عمیق اور انداز بڑا سلیس ہوتا ہے۔ یہ مقالہ طلوعِ اسلام میں شائع ہو جائے گا۔ اس کے بعد مذاکرہ کی دوسری نشست کا آغاز زیرِ صدارت محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ ہوا۔ اور یہ سلسلہ دو اڑھائی گھنٹے تک قائم رہا۔ مذاکرہ کی جاذبیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کی دونوں نشستیں پانچ چھ گھنٹے پر مشتمل تھیں، اور حصہ لینے والے طلباء اور طالبات ہی تھے۔ لیکن اتنے طویل عرصہ میں کیا مجال، جو سامعین میں سے کسی ایک نے بھی اپنی نشست چھوڑی ہو۔ اس سال مذاکرہ کا موضوع علامہ اقبالؒ کا یہ پیامِ حیات بخش تھا کہ ؎

یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت، فاتحِ عالم!
جہانِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مذاکرہ میں پیش کردہ مقالات طلوعِ اسلام میں بالاقساط شائع ہوتے رہیں گے۔

مذاکرہ کے آخر میں بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی طرف سے چھوٹی جماعتوں کے طلباء و طالبات کو خاص طور پر انعامات دیئے گئے۔ جس میں بیرونی حضرات نے بھی شرکت فرمائی۔

اتوار ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۵ء ½ 9 بجے صبح
(پانچواں کھلا اجلاس)

صدارت:۔ میجر جنرل ریٹائرڈ محمد نواز ملک
تلاوت قرآن کریم:۔ محمد اکرم راٹھور (کراچی)
کلام اقبال:۔ میجر جنرل ریٹائرڈ احسان الحق

یہ کنونشن کے آخری روز کا پہلا اجلاس تھا اور کشش کا یہ عالم کہ وقت سے پہلے ہی پنڈال کی نشستیں پُر ہونا شروع ہو گئیں۔ اس میں پرویز صاحب کے خطاب کا موضوع تھا۔

وہ ہمارا خواب تھا ــــ یہ خواب کی تعبیر ہے۔

یہ خطاب گوناں گوں تشریحات کے ساتھ قریب تین گھنٹہ تک جاری رہا۔ خطاب کیا تھا، ایک فغانِ جاں گداز تھی جو دل کی گہرائیوں سے ابھری اور فضاؤں کو چیرتی ہوئی اُن سوئے افلاک جا پہنچی۔ بیشتر مقامات ایسے آئے جہاں صاحبِ خطاب اور سامعین کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ یہ خطاب طلوعِ اسلام کی حالیہ اشاعت میں شامل ہے۔

اس میں البتہ ایک مختصر سے اضافہ کی ضرورت ہے۔ "زینو" نے پاکستان ٹائمز (لاہور) کی ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں اپنے ایک مقالہ کے ضمن میں لکھا تھا کہ مسٹر محمد حنیف رامے کو مسٹر غلام احمد پرویز کے معاشی اور سیاسی نظریات پر خاصا عبور حاصل ہے اور رامے صاحب کچھ وقت تک پرویز صاحب کی تحریک طلوعِ اسلام کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ پرویز صاحب نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ رامے صاحب تحریک طلوعِ اسلام کے ساتھ کبھی وابستہ نہیں رہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے مجھ پر جو بے پایاں احسانات ہیں، اُن میں ایک یہ بھی بڑا احسان ہے کہ ایسے لوگ میری تحریک میں کبھی شامل نہیں ہوئے۔

پرویز صاحب نے مجوزہ طلوعِ اسلام کالج کے سلسلہ میں حالیہ پوزیشن واضح کی۔ لیکن اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔

اس اجلاس کے بعد اور شام کے اجلاس سے پہلے درمیانی وقفہ میں مندوبین کا الوداعی اجلاس ہوا۔ انفلوئنزا کے حملہ اور کنونشن کی سرگرمیوں کی وجہ سے پرویز صاحب کی طبیعت خاصی ناساز تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے سابقہ روایت کے مطابق اپنے رفقائے سفر کو مقدس آرزوؤں کے ساتھ الوداع کہا۔

اتوار ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۵ء ۶ بجے شام
(چھٹا اور آخری کھلا اجلاس)

صدارت:۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) شیریں دل خاں نیازی
تلاوت قرآن کریم:۔ حافظ عبدالمجید صاحب
پیامِ اقبالؒ:۔ مرزا محمد خلیل صاحب۔

اِس آخری نشست کے سلسلہ میں یوں نظر آتا تھا، گویا سامعین پہلی نشست کے بعد پنڈال سے باہر نکلے ہی نہیں۔ چنانچہ عین وقت پر آنے والوں کو نشستوں کے پیچھے کھڑا رہنا پڑا۔ اس اجلاس میں پرویز صاحب کا موضوع تھا۔

جہاں مارکس ناکام رہ گیا —— اُس سے آگے۔

عنوان کی اہمیت اور کشش کا نتیجہ تھا کہ اس نشست میں سوشلسٹ حضرات بھی کافی تعداد میں نظر آئے۔ یہ خطاب قریب تین گھنٹے تک جاری رہا اور اس نے جو کیفیت پیدا کی، مجھے اس کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ ایک طرف تاریخی حقائق و معارف کا سیلاب تھا جو اُمڈے چلا آ رہا تھا اور دوسری طرف قرآنی اقدار و اصول کے ساحل تھے جو انہیں سیلابِ بلا انگیز بننے کی بجائے جوئے حیات بخش میں تبدیل کر رہے تھے۔ خطاب کے آخر میں یہ الفاظ بیک زبان سنے گئے کہ فی الواقعہ جہاں مارکس اور کمیونسٹ ناکام رہ گئے ہیں —— اور اپنی ناکامی کا انہیں اعتراف ہے —— وہاں سے آگے انسانیت کی منزلِ مقصود تک قرآنی راہنمائی ہی لے جا سکتی ہے۔ اِس خطاب کا پمفلٹ ہاتھوں ہاتھ تقسیم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن زیرِ طباعت ہے۔ اپنے وقت پر یہ طلوعِ اسلام میں شائع ہو جائے گا۔

اِس نشست کے ساتھ کنونشن کی یہ حسین و جمیل تقریب، جو پانچ دنوں پر مشتمل تھی، بحسن و خوبی تکمیل پذیر ہوئی۔ جنہوں نے اس میں شرکت کی وہ نہایت گہرے تاثرات دل و دماغ میں لے کر واپس گئے اور اب ان سب کو آئندہ کنونشن کا شدت سے انتظار ہے۔ خدا اِس سلسلہ کو قائم اور دائم رکھے۔

والسلام

طلوعِ اسلام کنونشن میں مندرجہ ذیل قرار دادیں اتفاقِ رائے سے پاس کی گئیں۔

قرارداد نمبر ۱

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس تحریکِ طلوعِ اسلام کے دیرینہ رفقاء (۱) صدر خان بخت جمال خان صاحب (۲) ظہور دین بھٹی صاحب (۳) عبداللہ جمال صاحب (۴) ڈاکٹر سرور جنگ مرزا صاحب (۵) امان اللہ خان صاحب اور (۶) خواجہ محمد حسین صاحب کی وفات پر دلی صدمہ محسوس کرتا اور ان کے (باقی بر صفحہ ۱۵)

پروفیسر علاؤالدین اخترؔ

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۵ء

نظریاتی اسلامی مملکت

میں فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت

آپ کو یاد ہوگا، میں گذشتہ تین سالوں سے آپ کے ساتھ اس موضوع پر بات چیت کرتا آ رہا ہوں کہ پاکستان ایک نظریاتی اسلامی ملک ہے۔ اس میں فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت کیونکر ہونی چاہیئے۔ اس ضمن میں پہلے دو سالوں میں جتنی باتیں بھی ہوئیں، وہ تعلیمی و تدریسی اداروں کے حوالے سے ہوئی تھیں۔ فکر و احساس کی تعلیم و تربیت میں دیگر معاشرتی اداروں کا جو حصّہ ہوتا ہے گذشتہ سال اس کا بھی ایک ہلکا سا جائزہ لیا گیا تھا۔ اور چونکہ میں ان سماجی، نشری اور سیاسی اداروں کا کوئی تنقیدی تجزیہ پیش نہیں کر سکا تھا جو کسی نظریاتی ملک کے رہنے والوں کو ان کا تشخص دیتے ہیں۔ ایسا تجزیہ پیش نہ کر سکنے کی چند وجوہات بھی پیش کی تھیں۔ میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آئندہ سالانہ جلسہ میں اس موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ ہو جائے تو شاید اس میں ایسی باتیں بلاواسطہ نتھر کر سامنے آ جائیں جن کا کوئی مختصر مقالہ جو پڑھا بھی جانا ہو متحمل نہیں ہو سکتا۔ یا جن باتوں کو تفصیل طور پہ تحریر میں لانا بسیار وقت طلب ہوتا ہے۔ مگر ایسا مذاکرہ چونکہ منعقد نہیں ہو رہا (مجھے کل ایسے ہی معلوم ہوا) اس لئے میں آج جب لکھنے بیٹھا تو مناسب یہی سمجھا کہ اپنی پرانی باتوں کو ذرا اور آگے بڑھاؤں۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے میں آپ کو پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے کہا تھا کہ پاکستانی اپنا تشخص اس وقت پا سکیں گے جب وہ اپنی کتاب آپ بن جائیں گے۔ اپنے اعمال کے آپ محاسب ہونگے اور اپنے خلاف آپ شہادت بننے کی جرأت ایمانی رکھ سکیں گے۔ ایسا نہ کر سکنے کے وقت تک نہ کوئی پاکستانی انفرادی طور پہ اپنے فکر و احساس کی اس طور تربیت کر سکے گا کہ اس کا وہم و گمان بھی اس تصور سے پاک ہو جائے کہ خدا کے سوا کوئی رب نہیں اور نہ بہ حیثیت قوم پاکستانیوں کا شمار ان خوش بخت لوگوں میں ہوگا، جن کے سب کام سنورتے رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ

کو مجھ سے اتفاق ہوگا۔ اگر میں یہ کہوں کہ پاکستان ایسے نظریاتی ملک میں شخصیت اور کردار کی پرورش اور بالیدگی ان خطوط پر کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ جب فکر و احساس کی تربیت کا راہ نما اصول یہ ہو کہ ہر فرد کی جملہ ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں خدا کی طرف سے ایسی امانت ہیں کہ وہ صرف خلقِ خدا کی خدمت میں ہی صرف ہو سکتی ہیں۔ اور جہاں افراد اور جماعتیں ملک کے مادی اور قدرتی وسائل پر قطعی کوئی ملکیتی حقوق نہ رکھتی ہوں وہاں عقیدے کی صحت کو معاشرے کے رگ و پے میں جاری و ساری کرنے کے لئے ایک خاص فضا پیدا کرنا ہوتی ہے، مسلسل محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ اگر تہذیبِ نفس حاصل کرنا ہے تو ایک ساز گار ذہنی، جسمانی اور عملی ماحول میسّر ہو۔ ایسا نہ تنہا تعلیمی ادارے کر سکتے ہیں اور نہ اپنی اپنی جگہ کوئی دوسرا ادارہ ہی یہ کر سکتا ہے۔ میری دانست (ISOLATION) میں ایسا کوئی ادارہ بھی مؤثر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تو طلوعِ اسلام ایسی تحریکوں کی ضرورت ہے جو صلہ اور ستائش کی تصور سے بے نیاز۔ نام و نمود کی خواہش سے بالا۔ کمال بے نیازی سے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے کام کر سکیں اور کام کرتی رہیں۔ جو اجر سے نظر اٹھا لیتا ہے اور دوسروں کے لئے اپنے علم و عمل سے ہدایت کی راہ روشن کرتا رہتا ہے، اللہ کا اس سے تائید و نصرت کا وعدہ ہے۔ ایسا کرنے کے لئے جناب پرویز ایسے خدا ترس بزرگوں کی ہم نشینی اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھ ایسا طالب علم تو فقط انفرادی اور اجتماعی فکر و احساس کی تعلیم و تربیت سے متعلق مبادیات پر کسی ایک جہت سے بات چیت ہی کر سکتا ہے۔ اپنے گذشتہ تین مقالوں میں غالباً میں یہ بھی کماحقہٗ طور پر نہیں کر پایا۔ صرف اس ضمن میں ہمارے ذہنوں پر جو گرد جمی ہوئی ہے، جان پڑتا ہے کہ صرف اس کی نشان دہی ہی کر سکا ہوں۔ قلب روشن تبھی ہوتے ہیں جب بندگانِ صفا کی ہمراہی میں خلوصِ دل سے سعی و عمل جاری رہیں۔ اللہ خلوصِ دل سے کام کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ میں آج کی نشست میں جناب گرامی قدر پرویز صاحب کی موجودگی کو اپنے لئے پھر سعادت سمجھتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ قرآن وہ مقدس الہامی تعلیمی اور تدریسی کتاب ہے جسے تھوڑا تھوڑا پڑھنا چاہیئے، سمجھنا چاہیئے اور مقدور بھر اس پر عمل کرنے کی خلوصِ دل سے کوشش کرنا چاہیئے۔ تاکہ توفیقِ الٰہی رفیق ہو جائے۔ اپنی پرانی بات چیت کو کچھ اور آگے بڑھا رہا ہوں۔ پہلے ایک تمہیدی بات عرض کر لوں —— میں آج بھی صرف ان چند ایک قرآنی احکامات اور اصولوں کا ذکر کروں گا جن کے حوالے سے پاکستان ایسے نظریاتی ملک میں انفرادی اور اجتماعی کردار اور شخصیت کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے۔ ایسا کرتے وقت میں نہ اپنے آپ کو تعلیمی اداروں تک محدود تصور کر رہا ہوں، اور نہ دیگر معاشرتی اداروں میں اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کروں گا اور نہ ہی اپنی بات چیت کو وسیع معاشرہ کے حوالہ سے آگے بڑھاؤں گا۔ مگر چونکہ اس محفل میں حاضر ہونے کا میں اخلاقی طور پر پابند ہوں —

یوں کہیئے کہ بات بہ حیثیتِ مجموعی آگے بڑھا رہا ہوں۔ ایسا کرنے کے اسباب پر بھی سردست غور کرنا غیر ضروری سمجھئے۔

اسلامی نظریاتی ملک میں یہ بات طے شدہ امر کے طور پر قبول کرنا ہوگی کہ نیت اعمال اور ایمان ہو تو انسان کی سعی بھی مشکور ہوتی ہے اور یہ کہ نیت اور ارادہ کو اعمال کے مقبول اور مردود بنانے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ جب تک نیتوں کی اصلاح نہیں ہوتی، نہ اعمال سنورتے ہیں اور نہ شخصیتیں نکھرتی ہیں، اور نیتوں کی اصلاح منافقانہ ماحول میں نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسے ماحول میں وہ باتیں کہی جاتی ہیں جن پر عمل نہیں ہوتا اور اللہ کو یہ بات ناگوار ہے کہ انسان منہ سے جو بات کہے وہ کرے نہیں۔ اسی لئے صحتِ عقیدہ کے حوالہ سے یہ کہنا نفسیاتی طور پر عین درست ہے کہ توفیقِ الٰہی کے بغیر نیت کی اصلاح ممکن نہیں۔ اور سائنسی اصطلاح میں توفیقِ الٰہی قول و عمل کی باہمی ہم آہنگی اور ہم آمیزش کا ہی دوسرا نام ہے۔ یہ دوسرا نام اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جو مذہبی اصطلاح میں تلاشِ حق کی تڑپ اور قبولِ حق کی استعداد کو زندگی کے ہر گام پر اور زیست کے ہر لمحہ پر بغیر کسی تضاد کے عمل اور مسلسل عمل میں ڈھالتا رہے۔ گویا قول و فعل اور دل و زبان کی یکسانیت کے عمل اور مسلسل عمل کو ہی توفیق کہا جا سکتا ہے اور یہ کسی فرد کو اسی وقت تک حاصل رہتی ہے جب تک وہ سیرت و کردار کی تشکیل میں داخلی اور خارجی محرکات کا تجزیہ کرتا رہتا اور یکسوئی عمل کی راہیں ہموار کرنے کی کوشش جاری رکھتا ہے۔

اسلام ہی پاکستان کی نظریاتی بنیاد ہے۔ نفسیاتی زبان میں اس کی تین جہتیں ہیں، جن سے یہ عبارت ہے۔ صحتِ عقیدہ۔ حسنِ معاشرہ اور تہذیبِ نفس۔ ان تینوں کا مفہوم اور ربط جب تک پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا یا ان کی باہمی اہمیت ذہن نشین نہیں ہوتی۔ نہ صالح فکر کے دریچے کھلتے ہیں نہ خدا ترسی کے احساسات کا وجود ملتا ہے اور نہ عمل کی وہ راہیں متعین ہوتی ہیں جو دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل بناتی ہیں اور یومِ حساب کی شرمساری سے بچا سکتی ہیں۔ فکر کی صحیح تربیت عقیدہ کی صحت کی ضامن تو ہو سکتی ہے، اور صحیح احساس آدابِ معیشت تو سکھا سکتے ہیں مگر جب تک صحیح عقیدہ اور صحیح احساس عمل کی قلمرو میں داخل نہیں ہوتے تہذیبِ نفس کی توقع نہیں آ سکتی۔ معاشرت میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ صحیح عقیدہ اور صحیح احساس کیونکر استوار کئے جاتے ہیں۔ ان کے راہ نما قرآنی اصولوں سے کسی حد تک یہ بحث گزشتہ سالوں میں کر چکے ہیں۔ یاددہانی کے لئے فقط اتنا کہہ لیں تو آج کی بات چیت سمجھ میں آتی چلی جائے گی کہ عقیدہ کی صحت اور احساس کی شادابی حاصل کرنے کے لئے یومنون بالغیب کا خوگر ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ بھی کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اللہ کے ہاں نیکی کا اجر بہت زیادہ ہے۔ لیکن گناہوں کی پاداش بھی ہے۔ چنانچہ یہ ہم

بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں ایسے لوگوں کی تو کمی نہیں جو اپنے عقیدے کی صحت سے بالکل غافل اور لاپرواہ ہوں۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسے افراد اور ادارے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جن کے عقیدے کی صحت انہیں راستبازی کی راہ چلنے کا حوصلہ اور ولولہ دیتی ہو یہی وجہ ہے کہ وہ ملک جو اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا، وہاں اپنے اوپر بھروسہ کرنے اور گھوم پھر کر اللہ کا فضل تلاش کرنے۔ علم کے حصول میں دنیاوی خلافت کا راز پانے اور باہم شیر و شکر ہونے کی بجائے وہاں انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر دریوزہ گری عام ہو گئی ہے اور عوام اور خواص، سب کی نظریں ظاہری اسباب پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ مسبب الاسباب کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ دل کے خیالات پر حساب جو بہت سخت چیز ہے اس کی طرف سے غفلت عادتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ فضیلتِ انسانی کے معیار تقویٰ کے علاوہ کچھ اور ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔ نفاق سے بچنے کی بجائے ہر سُو نفاق ہی نفاق ہے۔ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہو گئے ان حالات میں بھلا شخصیت اور کردار کی تعمیر و ترقی کے لئے وہ خمیر کہاں سے آ سکتا ہے جو صرف رزقِ حلال سے طاقت پاتا ہے۔ اگر فکر کی صحیح تربیت نہ ہو رہی ہو تو حق و باطل کی آمیزش ہوتی رہے گی۔ دیانت اور امانت میں جو سکون ہوتا ہے اس پر سے ایمان اٹھتا ہی چلا جائے گا۔ اور یہ شاذ ہی سیکھا جا سکے گا کہ جو چیز ہم خود اپنے لئے پسند نہیں کرتے اسے دوسروں کو دینا اسلامی شعار کیوں نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی فضا میں سانس لینے والوں کو یہ سمجھانا اور احساس دلانا بہت مشکل ہے کہ کیوں معاشرہ کی بہبود دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے مترادف ہے۔ کیوں صبر مجبوری کا نام نہیں۔ صبر قوتِ ارادی کو قوت پہنچانے کا ہی ایک شیوہ ہے۔ صبر ناگوارِ طبعی کو گوارا بنا کر خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر جینے کا نام ہے۔ اسی طرح اگر احساس عمل کے لئے تحریک کا کام نہ دیں گے تو حق کو جان بوجھ کر چھپایا جاتا ہی رہے گا۔ غریب و کمزور مارے ہی جاتے رہیں گے۔ سخی اور بخیل برابر تصور ہوتے ہی رہیں گے۔ راشی اور مرتشی پلتے ہی رہیں گے۔ ہر وقت دولت کی گھات میں لگا رہنے والا محتاج ہی رہے گا۔ خواہ اس کے پاس کتنی ہی دولت کیوں نہ ہو۔ کسی کے حق کو پامال کرتے وقت ظالم کے انجام کی طرف سے آنکھیں بند ہوتی ہی رہیں گی۔ چہروں کو شگفتگی اور دلوں کو سرور کبھی عطا نہ ہوگا۔ غرضیکہ دل کے گناہوں سے چشم پوشی جو فکر و احساس کی غلط تربیت کا لازمی نتیجہ ہے۔ وہ فکر اور احساس اور عمل سبھی کو اپنی تاریکیوں میں ڈھانپ کر مفلوج کرتی ہی رہے گی۔ اور نام نہاد شخصی اور سماجی مجبوریاں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک سے اجتناب پر اکساتی ہی رہیں گی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت بھی آ سکتی ہے کہ اصلاحِ معاشرہ اور حسنِ معاشرت کی تربیت کی اکثر و بیشتر راہیں مسدود ہو جائیں۔ اس سے پیشتر کہ اس نظریاتی ملک میں آنکھیں رکھتے ہوئے بھی لوگ بینائی سے محروم ہو جائیں اور کان رکھتے ہوئے بھی سُن نہ

سکیں اور دلوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ درد سے محروم ہو جائیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان بنیادی اصولوں کی روشنی میں فکر اور احساس کی تربیت کرنے کی سعی پیہم کریں، جن پر ملک کی بقا اور صحت کا دار و مدار ہے۔ اللہ کو یکتا اور یگانہ جانیں اور اس کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرنے کا درس عام کریں۔ اسی کو اپنا رب سمجھیں۔ ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا سیکھیں —— رشتہ دار کو اس کا حق ادا کریں۔ مسکین اور مسافر کا خیال رکھیں۔ نہ اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لیں کہ بخل طرۂ امتیاز ہو جائے اور نہ اسے اتنا کھول دیں کہ ملامت زدہ اور شکستہ حال ہو کر رہ جائیں۔ جس بات کی صحیح خبر نہ ہو، اس کے پیچھے نہ پڑیں۔ افواہوں پہ نہ جائیں۔ زمین پر اکڑ کر نہ چلیں۔ اتراتے نہ پھریں۔ بے حیائی کی باتوں سے بچیں کہ معاشرہ انہی باتوں سے بگڑتا ہے اور فرد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ہر ایسی بات سے احتراز کریں جو مہمل ہو، لچر ہو۔ بات کو احسن انداز سے کہنا سیکھیں تاکہ ذکر و فکر لوگوں کی خو بن جائے۔ اور وہ خیر کو سمجھیں، خیر کو پائیں۔ لغزشوں سے بچیں۔ خود غرضی اور نافرمانی کے عواقب سے آگاہ رہیں۔ کج بحثی سے دور رہیں۔ عہد بنیں اور عمل سے عمل کے نتائج پاتے رہیں۔ مختصراً یوں کہیئے کہ زندگی ایمان، اخلاص اور حسن اعمال سے عبارت ہے بغیر نظریاتی اسلامی ملک میں فکر و احساس کی مناسب تعلیم و تربیت کا ہر وہ منصوبہ جو تعلیمی اداروں کے لئے ہوگا یا دیگر معاشرتی اور فلاحی اداروں کے لئے وہ ناکام ہی رہے گا۔ آیئے مل کر دعا کریں کہ اے اللہ تو ہمیں عقل و نظر کی پاکی عطا کر۔ اے اللہ تو ہمیں علم و عمل کی پاکیزگی دے۔ خلوص و صبر سے نواز تاکہ ظاہر کی آراستگی اور باطن کی پاکیزگی ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو جائیں اور ایک صحت مند پاکستانی معاشرہ وجود میں آسکے۔ آمین

(بقیہ صفحہ سے آگے) پس ماندگان اور بزم ہائے طلوع اسلام سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

قرارداد نمبر ۲

تاریخ ہی کسی شخصیت یا تحریک کا بہترین سرمایہ ہوتی ہے اور اسے محفوظ کرنے والے قابل صد تحسین و آفرین۔ بزم طلوع اسلام کراچی اور بالخصوص اس کے فعال اور جواں ہمت نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب نے جس طرح حسب معمول تحریک کے ریکارڈ بصورت چارٹ وغیرہ EXHIBIT کئے ہیں، وہ اپنی مثال آپ اور قابل ستائش ہے۔ مندوبین کنونشن، ان کے بصمیم قلب شکر گذار ہیں اور ان کی مساعیٔ جمیلہ کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں۔

قرارداد نمبر ۳

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس بزم طلوع اسلام راولپنڈی کے ممتاز رکن ملک ظہور احمد صاحب کا بخلوص قلب شکر گذار ہے کہ انہوں نے مسلسل جانفشانی اور عرق ریزی سے مفکر قرآن محترم پرویز صاحب

(باقی صفحہ پر)

تفہیم القرآن کے حوالوں کی تصحیح

طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۵ء میں مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اس کے صفحہ ۶۲ پر حوروں کے سلسلہ میں مودودی صاحب کی جو تشریح درج کی گئی ہے، سہوِ کتابت سے اس کے حوالوں میں ابہام ہو گیا ہے۔ اس کی وضاحت درج ذیل ہے:۔

۱۔ جماعت اسلامی کے ترجمان اخبار ایشیا کی اشاعت بابت ۱۴ر جون ۱۹۶۹ء میں مودودی صاحب کے درسِ قرآن و حدیث کے سلسلہ میں حسب ذیل سوال اور جواب شائع ہوئے تھے۔

سوال:۔ آپ نے جنت میں ان خدمتگذار لڑکوں کے بارے میں تشریح کی ہے، جو ہمیشہ جوان رہیں گے۔ آپنے فرمایا ہے غالباً یہ لڑکے کفار کی نسل سے پیدا ہوئے ہوں گے اور کم سنی میں انتقال کر گئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ کفار کی لڑکیاں بھی کم سنی میں وفات پا گئی ہونگی۔ انہیں جنت میں کیا بنایا جائے گا؟

جواب:۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ البتہ میرا یہ قیاس ہے کہ جنت میں جو حوریں ہونگی وہ یہی کفار کی لڑکیاں ہونگی۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۶۹ء صفحہ ۶۲)

۲۔ مودودی صاحب نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد چہارم طبع اوّل کے صفحہ ۲۸۷ حاشیہ نمبر ۲۹ میں جنت کی حوروں کے متعلق لکھا ہے:۔

بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں سنِ رشد کو پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں..... ایسی لڑکیاں اہلِ جنت کے لئے حوریں بنا دی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۳ء صفحہ ۲۵)

۳۔ مودودی صاحب نے تفہیم القرآن جلد پنجم طبع اوّل صفحہ ۲۷۱ حاشیہ نمبر ۵۱ میں لکھا ہے:۔

خیموں سے مراد غالباً اس طرح کے خیمے ہیں جیسے امراء و رؤسا کے لئے سیرگاہوں میں لگائے جاتے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ اہلِ جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے، جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۵)

تبصرہ میں سیرگاہوں کی وضاحت میں "پکنک" کا لفظ تبصرہ نگار کی طرف سے لکھا گیا ہے۔

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۵ء

ہماری جمہوریت کے استحصالی انداز!

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

آج اگر میری باتوں میں کچھ بے ربطی نظر آئے یا ربط کی کمی محسوس ہو تو مجھے معاف فرمائیے گا، یہ بے ربطی، ربط و ضبط کی یہ کمی، یہ INDISCIPLINE ہماری قومی زندگی کا ایک دستور بن چکا ہے۔

بہت دنوں کی بات ہے، اس احساس کی چبھن، مجھے اپنے ایک صاحبِ اختیار دوست کے پاس لے گئی۔ (ان دنوں ان تک باریابی کچھ ایسی مشکل نہ تھی) میں ان سے اس بات کا گلہ کر بیٹھا، میں نے ان سے عرض کیا کہ اب تو یہ حال ہو گیا ہے، قانون سے بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ بے ضرر سے بے ضرر قانون، ایسا قانون جس میں اس کی پابندی کرنے والے ہی کی بھلائی ہو، وہ بھی اس قوم کی طبع نازک پہ گراں گزرتا ہے۔ ٹریفک کی سرخ لائٹ کی بھی کوئی پروا نہیں کرتا ـــــ یہ گلہ انہیں کچھ بُرا محسوس ہوا، کم از کم اسے انہوں نے خوش طبعی سے گوارا نہیں کیا، جو ان کے جواب سے ظاہر تھا۔ انہوں نے کہا، تو کیا ہر ٹریفک، سگنل پہ بھٹو خود جا کے کھڑا ہو جائے۔

قرآن پاک میں ایک جگہ یہودیوں کی نافرمانیوں اور حدود فراموشیوں کا ذکر ہے، وہاں ان کے ایک گناہ کا خاص تذکرہ ہے، کہ وہ سبت کے دن مچھلیاں پکڑتے تھے اور اس کے لئے بہانے تلاش کرتے تھے ـــــ تو کیا سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے کے بہانے تلاش کرنا اور ان بے بنیاد بہانوں کا سہارا لے کر مچھلیاں پکڑنا اتنا ہی بڑا جرم تھا، یا ہے، کہ اس کے لئے ایک قوم پہ تباہی نازل کر دی جائے۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ بادی النظر میں یہ اتنا بڑا جرم دکھائی نہیں دیتا ـــ پھر اب ایسا کیوں ہو رہا ہے، غور فرمانے کا مقام ہے، میں تو یہی سمجھ سکا ہوں کہ اس بات کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کی ذہنیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ معمولی سے معمولی، چھوٹے سے چھوٹے قانون کی پابندی بھی ان کے لئے گراں ہو گئی تھی اور وہ بے ضرر سے بے ضرر قانون سے بھی فرار کی راہیں تلاش کرتے تھے، یہ ان کی مجرمانہ ذہنیت کی دلیل تھی۔ جب کوئی قوم حدود فراموشی کی اس حد

تک پہنچ جائے تو اس پر عذاب الہی نازل ہو جاتا ہے ــــــــ

میرے محترم دوست کو اپنی قرآن فہمی پر بڑا ناز ہے، خدا جانے اس طرف ان کی نظر کیوں نہیں گئی۔

کیا ہم حدود فراموشیوں کی اس سطح تک نہیں آ گئے، جہاں پہنچ کر یہود پر خدائی حد نافذ ہو گئی تھی۔

مگر یہ تو غور و فکر کی بات ہے، ہم نے تو مدت ہوئی غور و فکر سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھا، جو تند و تیز آندھی آئی، اس کے ساتھ ہو لئے، جو بھی طوفان آیا اس کے ساتھ بہہ کر منزلِ مراد پا لینے کی آرزو پالتے رہے، اور جب کنارے پر پہنچے تو دیکھا کہ یہ موج تو ہمیں کسی اجنبی ساحل پر ڈال گئی تھی، یہ وہ منزل تو نہیں جس کی آرزو لے کر چلے تھے۔

ماضی قریب ہی کی بات ہے کہ ہم بگولہ بن کر اُٹھے، سیلابِ بلا بن کر شہروں کی سڑکوں اور گلیوں پر بہہ نکلے، گروہ در گروہ، انبوہ در انبوہ، جمہوریت کی نیلم پری کی تلاش میں سرگرداں نظر آئے، جوش میں ہم نے حفظ مراتب ترک کیا، شائستگی اور سماجی اخلاق کے سب بندھنوں کو توڑ دیا، جو قدر ہمارے سامنے آئی، ہم نے توڑ دی، ہم تو بس ایک جنون میں مبتلا تھے۔ "ڈھا دے جو کچھ ڈھینداے"۔

"ڈھا دے جو کچھ ڈھیندا ئے"۔ کہنے والے نے تو اسی سانس میں کہہ دیا تھا۔ "اک بندیاں دا دل نہ ڈھاویں" ــــــــ مگر ہم نے سب سے پہلے یہی قلعہ سر کیا، انہی قدروں پر وار کیا جن سے انسانیت عبارت ہے۔

اور جب جمہوریت کی سحر طلوع ہوئی اور اس نیلم پری کے چہرے سے نقاب اُترا تو ہم دم بخود رہ گئے کہ یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر، چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں ــــــــ

معروف جمہوری طریقے سے چنے گئے نمائندوں اور ان کے لیڈروں نے جس انداز سے اپنی ہی خانہ بربادی کا اہتمام کیا، جس طرح سے پوری ملت کی جد و جہد کا منہ چڑایا، وہ میرے آپ کے سامنے ہے اور ہم آج بھی اسی جمہوریت ــــــــ مغربی طرز کی جمہوریت کے والا و شیدا ہیں، نقاب اُلٹ جانے کے بعد بھی اس بت کافر کے سحر میں گرفتار ہیں ؎

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے

سوال یہ ہے، کیا انتخابات جمہوری طرز پر نہیں ہوئے تھے، کیا مجیب اور اس کے ساتھی ووٹ لے کر اوپر نہیں آئے تھے، پھر قومی اُمنگوں کا خون کیوں ہوا؟

کوئی اور قوم ہوتی تو سوچتی، ہم نے جنگ ہارنے اور اس میں مختلف عناصر کی ذمہ داری پر کمیشن تو بٹھایا مگر یہ غور کیوں نہیں کیا کہ جمہوریت یہ رنگ کیوں لائی؟ اس کے لئے ہم نے

کمیشن کیوں نہیں بٹھایا کہ جب جمہوریت اعلیٰ ترین طرزِ حکومت ہے اور ہمارے سنہ ۷۰ء کے انتخابات معروف جمہوری طریق سے ہوئے تھے تو اس کے ایسے نتائج کیوں نکلے ؛ جمہوریت اچھائی ہے تو اس میں سے بُرائی کا یہ پہلو کیوں نکلا، کیا قوموں کے دکھوں کا علاج جمہوریت کے اس نسخے میں ہے ؛ اگر یہ ایسا ہی مسیحائی نسخہ تھا تو مریض پہ یہ سانحہ کیوں گزرا، تشخیص غلط تھی یا نسخے میں کوئی خرابی ہے ؛

دنیا میں مختلف قوموں نے اپنے ہاں جمہوریت کو مختلف شکلوں میں رائج کر رکھا ہے۔ شاید اس لئے کہ ایک ہی طرز کی جمہوریت سب کو راس نہیں !

اور پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کیا واقعی ووٹ کا مروجہ طریقہ عوام کے حقیقی نمائندے چننے کا طریقہ ہے ــــ اگر ووٹروں کی تعداد ۱۰۰ فرض کر لی جائے اور فرض کر لیں کہ ایک الیکشن میں ۷۰ ووٹر اپنا یہ حق استعمال کرتے ہیں ، ۷۰ میں سے ۳۵ ووٹ ایک امیدوار حاصل کرتا ہے، ۲۰ دوسرا اور ۱۵ تیسرا ، تو کیا ۳۵ ووٹ حاصل کرنے والا اکثریت کا نمائندہ ہوا؛ آپ کی جمہوریت میں یہی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس نے ۱۰۰ میں سے صرف ۳۵ ووٹ لئے ہیں۔

اور پھر نمائندگی کی عملی صورت ابھی تک کیا ہے ، گاؤں میں بڑے بڑے زمیندار اپنے اثر و رسوخ سے ، مالک اور خداوندِ نعمت ہونے کی وجہ سے اور شہروں میں امیر کبیر اپنی دولت کے سہارے ، اپنے تعلقات کے بل پر ، سرکاری اہلکاروں کے تعاون سے منتخب ہو جاتے ہیں ، کیا یہ لوگ اپنی آبادی کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں ، فاقہ کشوں کا نمائندہ پیٹ بھرا کیسے ہو سکتا ہے مفلس کا نمائندہ امیر کیسے ہو سکتا ہے۔ محنت کش کا نمائندہ مترف کیسے ہو سکتا ہے ؛

آپ دل پہ ہاتھ رکھ کر ، سچ کہئے کہ آج کی دنیا میں ہر جگہ الیکشن پیسے کا کھیل نہیں ووٹروں کو ملنے کے لئے گاؤں گاؤں اور شہر شہر گھومتے پھرنا ، ان کی جا و بیجا خوشامد ، ان کے جائز و ناجائز مطالبات پورے کرنا ــــ ووٹ خریدنا ــــ آپ کہیں گے ، یہ ووٹ خریدنے والی بات کچھ فرسودہ سی ہو چکی ہے۔ مگر یہ ووٹروں پہ اثر انداز ہونا ، ان کے جذبات سے کھیلنا ، اشتہار بازی ، اور اخباری پروپیگنڈہ اور کیا ہے ؛ وقت کا اتنا ضیاع اور اتنے ڈھیر سے اخراجات کا متحمل کون ہو سکتا ہے ، کیا ایک عام پڑھا لکھا محنت کر کے روزی کمانے والا شخص ایسا کر سکتا ہے ؛ یقیناً نہیں ، ثبوت کے لئے آپ جب سے یہاں اس جمہوریت کا رواج ہوا ہے اسمبلیوں کے ممبروں کی فہرست نکلوا کر دیکھئے کہ ان میں کتنے محنت کش رہے ہیں ، کتنے ایسے تھے جو اپنی محنت کی کمائی کے بل پہ عوام کے نمائندہ کے ایوان تک پہنچ پائے ؛

یہاں میں دو لفظ ایسے استعمال کر گیا ہوں ، جنہوں نے مجھے آگے بڑھنے سے روک لیا ہے۔ ایک تو یہی محنت کے بل کمائی ہوئی روزی اور دوسرا لفظ ایک قرآنی اصطلاح مترف ،

ہے۔

دراصل یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہی تو ہیں۔ یہ پہلی اصطلاح بھی ایک قرآنی تصور ہی سے ماخوذ ہے۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی —— محنت کی کمائی ہی تو انسان کا حق ہے۔ جائز رزق —— رزقِ حلال اسی کا تو نام ہے اور جو رزق حلال نہیں کھاتا، جہاں محنت کوئی اور کرتا ہے اور کمائی کسی اور کی جیب میں، جو دوسروں کی کمائی اپنے تصرف میں لائے، دوسروں کی محنت کا ماحصل اپنے لئے حلال سمجھے، یہی تو مترف ہے۔

ہماری اسمبلیاں، ہمارے ایوانِ نمائندگان، موجودہ دور کی تمام جمہوریتیں مترفوں کی آماجگاہ ہیں۔ جہاں وہ اپنے حقوق، بلکہ اپنی لوٹ کھسوٹ کو جائز قرار دینے کے لئے قوانین وضع کرتے ہیں —— یہ ایوان انہوں نے ایسے قوانین وضع کرنے کے لئے بنا رکھے ہیں جو استحصال کی موجودہ شکل کو دوام بخش سکیں۔

انسانوں کے بنائے ہوئے سارے قوانین برسرِ اقتدار طبقے کی وہ کوششیں ہیں جن کے سہارے وہ اپنے طبقے کی بقا و دوام (اپنے طبقے یا کسی حد تک پارٹی) کے مفاد کا تحفظ اور دوسروں کے استحصال کو جاری رکھ سکنے کے قانونی جواز مہیا کرتا ہے —— لیکن ایک ناانصافی کو کچھ لوگ قانونی طور پر جائز قرار دے لیں تو وہ انصاف تو نہیں ہو جائے گا۔

مگر انسان اس سے آگے سوچ ہی کہاں سکتا ہے، انسان کا سب سے بڑا ہتھیار اس کی عقل ہے اور اس کی مشکل یہ ہے کہ یہ اپنی ناک سے آگے کچھ دیکھ ہی نہیں سکتی، سود خود پسند، نہ بلند سوز خیز، اور پھر عیار ایسی کہ علامہ اقبالؒ کے لفظوں میں، عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے، اس کے چکر سے نکلنا، انسان کے بس کی بات نہیں؛ اپنا مفاد اُسے اتنا بے بس بنا دیتا ہے۔ اپنے ہی جذبات اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں، انصاف اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جھوٹ، مکر اور فریب اسے خوش نما، اور خوش ادا نظر آتے ہیں۔ اسے یہ ہدایت کہ دیکھنا کسی قوم کی دشمنی تمہیں عدل کی راہ سے نہ ہٹا دے عقل کے بس کی بات ہی نہیں، دوستوں پہ عنایت، کمزوروں کی دستگیری، اجنبیوں سے مروت۔ یہ سب تو کسی نہ کسی مفاد کے تحت قابلِ قبول ہی نہیں مستحسن کہی جا سکتی ہیں مگر دشمن سے انصاف یہ تو عقل سے بلندتر ہی کوئی چیز کہہ سکتی ہے —— یہ بات وحی کی رہنمائی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

صدیوں کی پریشان انسانیت کو ایک دانائے راز نے یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا
اس نے اپنی آنکھوں سے مغربی سامراج کی چیرہ دستیاں دیکھیں، اس کا بظاہر فریب چکاچوند کر دینے والا جمال دیکھا —— (خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ) —— مگر اس کا مآل بھی اس کی نظروں میں رہا۔

سرخ سامراج کی چڑھتی ہوئی آندھی جو بظاہر کمزوروں، ناتوانوں، کچلے ہوؤں کے حقوق کو آگے لے جانے کے دعوؤں کے ساتھ اٹھی تھی۔ اس بگولے کا انجام بھی اس کی اصل وجود کو چیر سکنے والی نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا، اس لئے شروع ہی میں دیکھ لیا کہ اس کو اساسِ محکم میسر نہیں، اپنی راہ سے بھٹکنا اس کا مقدر ہو چکا ہے۔ اس لئے اسی وقت کہا تھا ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے   جستہ ای او را اساسِ محکمے

اسے معلوم تھا یہ اساسِ محکم اسے عقل کے ایوانوں سے نہیں مل سکتی، اور وحی اپنی اصل شکل میں مغرب کی تعصب زدہ نظر میں آ نہیں سکتی، اور پھر وہ جو اپنے آپ کو حاملِ کتاب کہتے ہیں وہ تو دنیا کی قوموں میں کسی شمار قطار ہی میں نہ تھے، پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم کی نظر میں یہ وہ صفر ہیں جن کو جمع کرتے جاؤ تو حاصل جمع صفر ہی رہتا ہے۔ ایسی قومیں کسی کی راہنمائی کیا کر سکتی ہیں، اور یہ قومیں یوں بھی مختلف جغرافیائی بندھنوں میں بندھ کر، عراقی، شامی، مصری وغیرہ بن چکے ہیں، وہ بھی انہی خداؤں کو پوجتے ہیں، جن کے متعلق اس دانائے راز نے کہا تھا ——— ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے، جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے۔ یہ خود اس اساسِ محکم سے محروم لوگوں کا انبوہ ہے، قومیں کہاں؟

اس برصغیر کے مسلمانوں کے دل میں اس مذہب سے ایک والہانہ لگاؤ، ایک بے پناہ محبت اس کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کا ایک لازوال جذبہ ...... تھا، اور مغربی سامراج سے آزادی کی صورت میں، اس مغربی جمہوریت میں ان کی آزاد امنگوں کی پامالی بھی اس کی نظر سے اوجھل نہ تھی۔ اس قوم کو اس نے ایک نئی راہ سجھائی، نجات کا ایک رستہ دکھایا، اس کو نیا ولولہ دیا، اسے ایک ایسے خطۂ زمین حاصل کرنے کی راہ پر ڈال دیا۔ جہاں مسلمان ہی نہیں اسلام بھی آزاد ہو۔

اسلام کو غلام بنا رکھا تھا ملائیت اور خانقاہیت کی مصلحت کوشیوں نے، شہنشاہوں نے اپنے اقتدار کے لئے اسے ڈھال بنا رکھا تھا اور مسلمان صدیوں سے کشتۂ سلطانی ملائی و پیری کا ایک دلدوز نقشہ پیش کرتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اسلام کو عرب ملوکیت کی چھاپ سے بھی اسی طرح آزاد کر دیا جائے۔ جس طرح مجوسی سازشوں کی تخریب کاری، (SUBVERSION) سے اور اس کے لئے اس نے پاکستان کا تصور دیا۔ جس میں پہلے سے کوئی طریقِ حکومت نہ تھا، کوئی روایت (TRADITION) نہ تھی تاکہ یہاں آسانی سے نئی (TRADITION) کی طرح ڈالی جائے، ایک ایسا خطۂ زمین جہاں کسی انسان کی، انسانوں کے کسی گروہ کی حکومت نہ ہو، ان معنوں میں کہ انسانوں کو انسانوں پر حکومت

کرنے کے لئے اپنی مرضی کے قوانین بنانے کا اختیار نہ ہو، جہاں خدا کے دئے ہوئے قانون کی حکمرانی ہو، جہاں آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتابِ پاک کرتی ہو۔

اس دانائے راز کے بعد اک مردِ خود آگاہ اس بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لایا اور اس قافلے کو کفر آباد ہند سے اک خطۂ پاک میں لا اتارا۔

اس ملک میں ہماری وجہ جامعیت، ہمارا ایک آئیڈیالوجی پر ایمان تھا، یہاں کے رہنے والے کو یہ سمجھنا تھا کہ، اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے، اصل مقصد یہ خطۂ زمین نہیں، وہ تصورِ حیات ہے جس کے لئے یہ خطہ حاصل کیا گیا ہے ـــــ اور سات سال کی بے مثل جدوجہد کے بعد، دنیا کے نقشے پر ہانچویں بڑی ملتِ اسلامیہ کی برادری میں سب سے بڑی مملکت وجود میں آئی اور تاریخ انسانیت میں پہلی بار ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا گیا، جہاں ایک مشترک ایمان کی بنیاد پر حکومت قائم کرنا مقصود تھا۔

صدیوں بعد یہ ہماری بہت بڑی جیت تھی اور حریفوں کے لئے بہت بڑا چیلنج۔

ہمارا قافلہ آبِ رود رادی کے کنارے ایسا سستایا کہ وہ اپنے مقصد ہی سے بے خبر ہو گیا، لٹے پٹے، بے گھر، بے در لوگوں کو الاٹمنٹوں کے چکر میں ایسا الجھایا گیا، گویا یہی ان کا مقصد تھا کہ مالِ غنیمت سمجھ کر غیر کے مال پر قبضہ کیا جائے ـــــ عوام کو اس لالچ میں الجھا کر ارباب حکومت اقتدار کے چکر میں کھو گئے اور تاجروں، طائع آزماؤں، افسروں، زمینداروں کو کھلی چھٹی مل گئی اور انہوں نے اس آزادی سے خوب فائدہ اٹھایا، وہ تو گویا اس جنگل کے شیر بن گئے اور بیانگِ دہل کہا۔

شیروں کو آزادی ہے جس کو چاہیں چیریں پھاڑیں

اور روشنی کی تلاش میں نکلا ہوا یہ قافلہ گھپ اندھیرے جنگلوں میں کھو گیا۔ جہاں ہر طرف ننگ اور شغال تھے۔ جیسے ایک نئی قوم، ایک نئی برادری، ایک نئی قوت بن کر ابھرنا تھا۔ ایک بے نظم بھیڑ، بھیڑوں کا ایک بکھرا ہوا گلہ، اور منتشر لوگوں کا ایک ہجوم ہو گیا جو مفاد خویش کے چکر میں ہیں، جو اندھا دھند زرگری اور زراندوزی کی دوڑ میں ایک دوسرے کو کچلتے، ایک دوسرے ہی کو نہیں تمام اعلیٰ انسانی اقدار کو روندتے ہوئے خدا جانے کدھر رواں ہیں۔ خوب اور ناخوب کے چکر میں نہیں پڑتے، جس طریق سے کام چلتا ہو جائز ہے۔ گناہ و ثواب، آخرت، حیاتِ بعد الممات کا تصور آہستہ آہستہ ناپید ہو گیا۔ یا پھر خود فریبی کے لئے بے روح عبادات و وظائف۔ پیروں فقیروں کے آستانوں اور مزاروں پر حاضری پر زور دیا جانے لگا اور یوں یہ اُمت خرافات میں کھو گئی۔

جب کوئی پتھر بلندی سے لڑھکتا ہے تو پاتال کی گہرائیوں تک لڑھکتا ہی چلا جاتا ہے اور جوں جوں یہ تنزل کا فیصلہ طے کرتا ہے، اس کی رفتار بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، تفصیل

آپ کو بھی ہمارے اس سفر کی معلوم ہے، دہرانا لاحاصل ہے۔ لاحاصل بھی اور تکلیف دہ بھی۔
جب ہم ایمان کے اشتراک سے ایک قوم نہ بن سکے۔ (کیوں کہ ایمان سے ہم بیگانہ تھے) تو ہم قومیتوں میں بٹ گئے اور ایسے بٹے کہ بہت جلد کوتاہ اندیش، خود غرض لیڈروں کی وجہ سے جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ ساری قوم کے مفاد کو دیکھنے کی بجائے اپنی قومیت کے حقوق پر زور دیا جانے لگا اور وہی خطوط جن کو ہم نے اپنی ہجرت کے وقت بے وقعت بنا دیا تھا، ہمارے پاؤں کی زنجیر بن گئے۔ پاؤں ہی کی نہیں، ہمارے دماغ ان میں اُلجھ گئے۔ ہمارے دل ان میں اٹک کر رہ گئے، ہم مصطفوی نہ بن سکے، رب المشرقین و رب المغربین کا ورد کرنے والے پہلے تو مشرقی اور مغربی پاکستانی بنے اور پھر بنگالی اور غیر بنگالی، غیر بنگالی جنہیں نفرت سے مشرقی حصے میں پہلے بہاری، اور پھر گالی کے طور پر پنجابی کہا جانے لگا۔

دشمن تاک میں تھا، ہماری کوتاہیوں کا اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم نے ان اینٹوں کو یونہی چُن دیا ہے۔ ایک دوسرے کے اوپر بغیر اخوت و محبت کا سیمنٹ لگائے رکھ دیا ہے، اس نے کمال ہوشیاری سے ان کی سیدھ میں فرق ڈالنے کی کوشش شروع کر دی اور آہستہ آہستہ کل کے ساتھی، کل کے بھائی، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، ہجرت، مہاجر کی جن اصطلاحوں کو ہم نے اس دور میں اپنایا تھا، اسے اگر ذرا آگے بڑھایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کے انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے خون سے، جنہیں کل انہوں نے پناہ دی تھی، خوب ہاتھ رنگے، جنہیں ابھی کل انہوں نے گلے لگایا تھا۔ آج ان کے گلے بے دریغ کاٹے اور اس پر فخر کیا۔

میں نے ابھی کہا تھا، قیامِ پاکستان، صدیوں کے بعد ہماری بہت بڑی جیت تھی، جہاں یہ ہماری بہت بڑی جیت تھی، ..... وہاں حریفوں کے لئے بہت بڑا چیلنج بھی تھا، دشمنوں نے یہ چیلنج قبول کر لیا تھا، وہ ہمیں مات دینے کے لئے اپنی چالیں چلتا رہا اور ہم اپنی ہر چال بھول گئے اور مفادِ خویش کے چکر میں گھومنے لگ گئے، کولہو کا بیل کتنا ہی گھوم لے، تھک تو سکتا ہے مگر کہیں پہنچ نہیں پاتا ــــ اور قیامِ پاکستان کے ۲۵ سال بعد ہی ہم اپنی تاریخ کے غالباً سب سے بڑے المیے سے دوچار ہو گئے۔

ہمارے مخالفوں نے اسے دو قومی نظریئے کی شکست اور اس کے باطل ہونے کا ثبوت کہا اور ہم اس کے بعد بھی نہ سنبھل پائے، ہم نے اپنی بنیادی کمزوری پر غور نہ کیا۔ ہم نے اپنے آئیڈیل کو یہاں کے رہنے والوں کے دلوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس حصے میں بھی جہاں جغرافیائی بُعد بھی نہیں، جسے ہم ایک وحدت کی شکل میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ ہم لخت لخت ہو رہے ہیں۔ سندھ سے ایک سید اٹھا جس نے کھرے سے اپنے رشتے کو مقدس بنا دیا۔

سرحد سے ایک ولی اٹھا، جس کا قبلہ و کعبہ ہی کہیں اور تھا، اور بلوچستان کے سرداروں میں سے ہر ایک نے اپنے علاقے میں انا ربکم الاعلیٰ کا اعلان کر دیا۔

یہاں چار قومیتوں کا پرچار کیا جانے لگا، کہیں سندھو دیش کا نعرہ لگا، کہیں پختونستان کا شوشہ چھوڑا گیا، کہیں عظیم تر بلوچستان کا سراب دکھایا گیا ——— اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا ——— لے دے کے ایک پنجاب رہ گیا تھا، جہاں سے پاکستان کی آواز اٹھتی تھی، جہاں دل پاکستان کے لئے دھڑکتے تھے۔ جہاں کے مسلمان نے مسلمانانِ عالم کے لئے تڑپ ورثے میں پائی تھی۔ سمرنا میں ظلم ہوا تو یہاں عورتیں گلیوں میں بین کرتی ہوئی سنی گئیں۔ فلسطینیوں پہ عرصۂ حیات تنگ ہوا تو پنجاب کے مسلمانوں نے اپنا سانس سینے میں رکتا ہوا محسوس کیا۔ یہ سرزمین جس نے اقبالؒ اور ظفر علی سے (INSPIRATION) لی تھی، اس میں بھی اقتدار سے محروم لوگوں نے، وہ سیاست کے کاریگر ہوں یا خود ساختہ دانشور، ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

کہیں پنجاب کے حقوق کی دہائی دی جا رہی ہے، کہیں پنجاب کے حصّے کی، کہیں پنجاب کے کلچر کا نوجوانوں کو ظفر علی کی اسلامی سوچ، اقبال کی آفاقیت سے ہٹا کر صوفی شاعروں کی گود میں ڈالا جا رہا ہے۔

اپنے اقتدار کی خاطر جو آگ بھڑکائی جا رہی ہے اس کے نو دیئے شعلے دور سے نظر آتے ہیں تو پاکستان سے محبت کرنے والے دل کانپ اٹھتے ہیں، جس روشنی کی نوید دی جا رہی ہے وہ انہیں شعلوں کی چمک تو نہیں ؎

دل دھڑکتا ہے، قدم رکتے ہیں گلشن کے قریب آج یہ کیسا اجالا ہے نشیمن کے قریب

نعروں پہ پلی ہوئی قوم کو ایک نعرہ لگا کر پھسلایا جا رہا ہے اور سیماب صفت قوم ہر نئے نعرے کے پیچھے لپک پڑتی ہے، لوگ خود بدعنوانیوں کو فروغ دینے کا موجب ہوتے ہیں، خود اس بدعنوان معاشرے کا فعال حصہ ہیں۔ مگر جب کوئی کسی بدعنوانی کے خلاف نعرہ لگاتا ہے تو بغیر دیکھے کہ ایسا کون کر رہا ہے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ شاید یہ ان کے ضمیر کی ملامت ہوتی ہے اور اپنے داغ دھونے کے لئے ہر اس آواز پر لبیک کہہ اٹھتے ہیں، جو اس معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے کا دعویٰ لے کر آتی ہے اور اب قوم،

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ

کی تصویر بن گئی ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ قوم کی ذہنی تربیت کا کسی نے کوئی اہتمام نہیں کیا، قوم کا ہر خادم ووٹ کے وقت قوم کے پاس آیا، تو نعرہ پہ نعرہ لگاتا گیا، اور وعدے پہ وعدہ کرتا چلا گیا، نہ اپنے

وسائل کا خیال رکھا، نہ اپنے قواء کا، نہ اپنے ساتھیوں کے ایمان کا، سفید باغ، سبز باغ، کالے باغ بھی یکجا کر دیئے گئے۔ کچھ دیر تو پراپیگنڈے کے بل پر کام چلا مگر حقیقتیں آخر حقیقتیں ہوتی ہیں، وہ تو آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لئے سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں۔

لیگ کے نمائندے جب اقتدار میں آئے تو اپنا آپ بھول بیٹھے، سقوطِ ڈھاکہ کے وقت قوم ایک عجیب کرب میں مبتلا تھی، اس میں رنج و غم بھی تھا، غصہ اور انتقام کا جذبہ بھی، اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا احساس بھی، اپنی کم مائیگی پر شرمندگی بھی۔

نئی قیادت سامنے تھی، قوم کی ذہنی تربیت کا، مرحوم صدر ایوب کے ابتدائی دور کے بعد یہ بہترین وقت تھا۔ اسے سمجھایا جاتا، اسے صاف لفظوں میں بتایا جاتا۔ ایسا کیوں ہوا، کون کون سی غفلت، کون کون سی کوتاہی اس کا باعث بنی۔ اس لئے نہیں کہ شکست خوردہ قوم کے انتقام کی آگ کچھ لوگوں یا کچھ اداروں یا کچھ پارٹیوں کی طرف پھیر کر بات ختم کر دی جائے۔ (اندھا غصہ، اندھا انتقام تو خون بہا کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ دشمن اس سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کا خلفشار قوم کو مزید تقسیم کر دیتا ہے) بلکہ اس لئے کہ قوم کو غلطیوں کی نشاندہی کر کے اسے ایک تعمیری راہ پر لگا دیا جائے تاکہ یہ غلطیاں دہرائی نہ جائیں، جو ہماری ذلت و رسوائی کا باعث ہوئیں ـــــ مگر اس کے لئے قربانی اور ایثار کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے، سادگی اور سچائی کو اپنے ہتھیار بنانا پڑتا ہے۔ مگر یہاں تو ان لوگوں کے رویے سے محسوس ہوا کہ کل میکبتھ کے موڑ پر رکتی ہوئی، مدتوں کی تشنگی تھی، میں نہ تھا والا معاملہ ہے، یہ قربانی و ایثار پیشگی کے دعوے، عصمت بی بی از بیچارگی تھی۔ موقعہ ملا تو ان لوگوں نے بھی خوب پر پرزے نکالے، ان عوامیوں کے کچے چٹھے اب آپس کی سر پھٹول کی وجہ سے منظرِ عام پر آ رہے ہیں مگر اتنا تو شروع ہی میں پتہ چل گیا تھا کہ یہ وزیر بھی پہلے وزیروں سے کچھ مختلف نہ تھے۔

ملک آدھا ہو چکا تھا، اس بچے کھچے حصے میں بھی دشمن کی فوجیں ہمارے علاقوں پر قابض تھیں۔ ان علاقوں سے بھاگ کر آئے ہوئے لوگ بے گھر، بے در پڑے تھے۔ وزیروں کی کوٹھیوں میں نئی FURNISHING ہو رہی تھی، ان کے لئے نئی گاڑیوں کا بندوبست ہو رہا تھا..... کیا ان سے پہلے جو وزیر گئے تھے وہ فرنیچر اور دوسرا سامان ساتھ لے گئے تھے، اگر لے گئے تھے تو کیا وہ ملک سے باہر چلے گئے تھے یا ملک کے قانون سے باہر تھے۔ اگر وہ سامان انہی بنگلوں میں تھا تو کیا ایوب خانی وزیروں کا سامان ان عوامی وزیروں کے شایانِ شان نہ تھا؟ یہی نہیں وہ جنہوں نے دعوے کیا تھا کہ ہم حجروں میں بیٹھ کر کام کریں گے، ایئر کنڈیشنڈ مرسیڈیز کے بغیر سفر کرنا ہتک سمجھنے لگے اور خلق خدا تھی کہ فریاد کناں تھی ؎

خدا وندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں!
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

حالات کو بہتر بنانے کے دعوے کرنے والوں کے دور میں ہر بدعنوانی زیادتی کی طرف سفر کرتی رہی۔ رشوت، سفارشیں بڑھ گئیں۔ ذخیرہ اندوزی، سمگلنگ، بلیک اسی طرح رہی —— ملک میں چینی کا توڑا نظر آیا تو کروڑوں کی چینی درآمد کر لی گئی —— بعد میں ایک ڈی اثر نے اپنے ایک انٹرویو میں پبلک پر یہ طنز بھی کی یہ کیسی محبِ وطن پبلک ہے جو ایک چھٹانک چینی کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتی۔

نازک مزاج شاہاں تابِ سخن نہ دارند، ورنہ یہ غریبِ شہر انٹرویو پڑھ کر سوچ رہا تھا کہ اسی رسالے کو کہے کہ عوام میں سے بھی کسی کا انٹرویو لیا ہوتا —— کسی صاحبِ اقتدار نے ایک دن نہیں، ایک وقت پھیکی چائے پی کر لوگوں سے اپیل کی ہے کہ لوگو، آؤ ہم آپ سب کچھ عرصہ بغیر چینی کے یا جتنی چینی ہمیں میسّر ہو سکتی ہے، کے ساتھ گزارا کریں۔ نہ کسی سرکاری دعوت میں میٹھی چیزیں ہوں گی، نہ کسی وزیر، امیر کبیر، صاحبِ اقتدار کے گھر راشن کی مقرر کردہ چینی سے زیادہ چینی جائے گی۔ پہلے خود ایک راستے پر چل کر دوسروں سے اس پر چلنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ خود سادگی اختیار کر کے دوسروں کو سادگی کی تلقین کی جا سکتی ہے مگر یہاں تو وزارت سے پہلے کے کھدر پوش بھی شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے لباسوں میں ملبوس نظر آنے لگے۔ وہی دعوتیں، وہی پارٹیاں، وہی رسومِ افتتاح، فیتے کاٹنے، سنگِ بنیاد رکھنے کی رسمیں، وہی انٹرکانٹی میں کئی کئی دنوں کے سمینار —— مجھے تو یہ سمینار اور سمٹ مینار —— قومِ عاد کی ان نمائشی عمارتوں کی نئی شکلیں محسوس ہوتی ہیں، جن کی افادیت کچھ نہیں ہوتی، محض دکھاوا ہوتا ہے۔

وقت گزرتا جا رہا ہے، وقت کسی کا بھی دوست نہیں، یہ کسی کے لئے بھی نہیں رکتا اور ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے، ہم مہلت کے وقفے میں سے گزر رہے ہیں، مہلت کا وقفہ گزر جائے تو آئی کو کوئی نہیں ٹال سکتا، اس وقت گلہ بھی، گریہ و زاری، منت گزاری، اصلاحِ احوال کے ارادے اور یقین دہانیاں سب بیکار ہوتی ہیں، پھر وقت کے طوفان کے دھارے میں سب بنگلہ دیش زیرِ آب آ جاتے ہیں، وقت کا روڈ رولر سب بلند و پست کو ایک کر دیتا ہے اور اس کے بعد کل کی، بظاہر زندہ اور متحرک قومیں قرآنِ پاک کے لفظوں میں یوں ہو جاتی ہیں، جیسے بجھا ہوا شعلہ، جیسے کٹا ہوا کھیت!

آج بھی کرنے کا کام وہی ہے جو آج سے ۲۸ سال پہلے تھا، اس قوم کو یہ سمجھا دیا جائے، اس بات کا اسے پختہ یقین دلا دیا جائے کہ وہ ایک مشترک آئیڈیل پر ایمان کی بنا پر ایک قوم ہے، ایسا آئیڈیل جو رنگ، نسل وغیرہ کے امتیازات سے بلند تر ہے، جس پر ایمان کا تقاضا ایک

ایسے معاشرے کا قیام ہے جہاں ہر شخص یکساں واجب التکریم ہو، ہر شخص محنت کرے، جس معاشرے میں کوئی بھوکا ننگا نہ ہوگا۔ بے گھر، بے در، بے ٹھکانہ نہ ہو، کوئی بے آسرا نہ ہو، کوئی اجنبی، بے سہارا اور تنہا نہ ہو، جہاں کسی کے ذہن پر کسی قسم کا خوف، کسی کے دل میں کوئی حزن نہ ہو —— ایسا معاشرہ قائم کرنے کی جدوجہد کا عزم ان کی وجہ جامعیت ہے۔ یہ ان کے ایمان کا تقاضا ہے کہ قرآن پاک کے دیئے ہوئے تصورِ الارض للّٰہ اور قل العفو پر مبنی معاشی انقلاب برپا کیا جائے، اس کے بغیر ان کا ایمان ناقص ہوگا۔

قوم کو بے کار مباحث سے دور رکھنے کے لئے عمل کی راہ پر ڈالنا ہوگا۔

ایک بار پھر اسے ایک آئیڈیل دینا ہوگا۔ ایک منزل مقرر کرنا ہوگی جو اس کے عمل کی سمت متعین کرے اور وہ آئیڈیل ہے پاکستان کی تکمیل، یعنی جس مقصد کی خاطر یہ خطۂ زمین لیا گیا تھا۔ اس نظام کو یہاں متشکل کر کے دکھایا جائے اور اس کی جغرافیائی تکمیل کو بھی ذہنوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے اس کے لئے قوم کو سخت قسم کے ڈسپلن کا خوگر کر کے لوگوں کی خفتہ صلاحیتوں کو ابھارا جا سکتا ہے۔

یہ مٹی بہت زرخیز ہے، قوم صلاحیتوں سے بھری پڑی ہے اور زمین خزائنِ قدرت سے، ان کو بروئے کار لانا ہی تعمیر کی ضمانت ہے۔

قوم کو یہ سمجھانا ہوگا کہ یہ بڑی جان جوکھوں کا کام ہے، اس کے لئے بہت سی سہولتوں کو تیاگنا، بہت سی مراعات سے محرومی اور بہت سی مشکلات کو اپنانا ہوگا، یہ مصنوعی معیارِ زیست STANDARD OF LIVING جسے قائم رکھنے کے لئے باہر سے امداد کی بھیک مانگنا پڑتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی ان دان کرنے والوں کے دباؤ اور اثرات کو بھی قبول کرنا پڑتا ہے، کو چھوڑ کر سادگی اور محنت کو شعار بنانا ہوگا، تعیش کی چیزیں تو ایک طرف، عام استعمال کی چیزوں کی فراوانی سے بھی منہ موڑ کر کچھ دیر محض ضروریات پر اکتفا کرنا ہوگا، اگر چند سال بھی اس پر عمل کیا جائے تو نہ یہ افراطِ زر رہے گی، نہ چیزوں کی ریل پیل اور فراوانی میں محرومی کا احساس رہے گا۔ مشرق میں ایک ملک نے قربانی اور ایثار کا اجتماعی راستہ اختیار کیا ہے اور دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ نہ اسے سامراجیوں سے بھیک مانگنا پڑی ہے، نہ اس کے اثرات قبول کرنے پڑے ہیں، نہ وہاں افراطِ زر ہے، نہ بلیک، نہ سمگلنگ —— خود موٹا جھوٹا پہنتے ہیں اور ریشم ایکسپورٹ کرتے ہیں، یہ چھوٹے اور بڑے ملک کا بھی سوال نہیں، جذبے اور لگن کی بات ہے۔ چھوٹی قوم بھی ان خصوصیات کو اپنا لے تو ناقابلِ تسخیر بن جاتی ہے اور آج کی دنیا میں تو کوئی قوم دوسری کو تسخیر نہیں کر سکتی جب تک کہ خود اس قوم کے اندر قومی وحدت میں دراڑیں نہ پڑ چکی ہوں۔ اقتصادی، سماجی، عدم مساوات کی وجہ سے اختلاف نہ ہو چکے ہوں۔

ہم کل بھی یہ رستہ اپنا سکتے تھے، آج بھی ہمارے لئے یہی پنپ سکنے کا راستہ ہے۔ ہر شخص

اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کام میں مصروف اور محض ضروریات پر اکتفا کرے، باقی سب کچھ خدا کے نظام کی سربلندی کے لئے وقف کر دے، سمجھ لے کہ آئندہ نسلوں کو قوموں کی برادری میں باعزت مقام دلانے کے لئے اس وقت عیاشیوں بلکہ سہولتوں سے رضاکارانہ اجتناب وہ قیمت ہے جو ہمیں دینا ہے ـــــ نہ ہمارے کاریگر کسی سے کم ہیں، نہ مزدور، نہ طالب علم، نہ کسان، مترفوں کو درمیان سے ہٹانا ہوگا۔

لیکن یہ سب کہتے کہتے مجھے خیال آیا ہے کہ میں بھی تو خالی باتیں کر رہا ہوں، ایسا ہونا چاہیئے۔ ایسے ہو تو یوں ہو جائے گا، حالات تو کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں، ان کو بہرحال کسی طرح تو موڑنا ہوگا۔ ہم مانیں نہ مانیں، لاکھ اسے تُرا کہیں، مگر ابھی مروج جمہوری طریقوں سے مفر نہیں۔ انہی میں بہتری کی صورت کیسے پیدا ہو۔

آج جو چیزیں پبلک OPINION، رائے عامہ پر اثرانداز ہوتی ہیں ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ہم اب تک ہنگامہ خیز سیاست کے چکر میں گرفتار ہیں، حالات سے مایوسی ہوتی ہے تو کوئی ہوشیار طالع آزما جس کے گھر دانے اور تجوریوں میں مال ہوتا ہے، آتا ہے۔ لوگوں سے وعدے کرتا ہے، سبز باغ دکھاتا ہے، اکثر انہی کا ساتھی ہوتا ہے جو ان مایوس کن حالات کو پیدا کرنے والے ہوتے ہیں، یہ کھڑا ہو کے نعرہ لگاتا ہے کہ یہ لوگ ناکام ہو گئے ہیں (ہم لوگ کبھی نہیں کہتا) میں تمہیں حالات بدل کر دکھاؤں گا، جو کچھ ان لوگوں نے کرنے کا وعدہ کیا تھا اور نہیں کر سکے وہ میں کروں گا۔ اس نے تمہیں دھوکا دیا، میں امید کا شہزادہ بن کر آیا ہوں، میرے جلو میں چلو، میں منزلِ مراد تک پہنچاؤں گا، اور قوم اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ بہتری کی تمنا اس کے دلِ بے تاب کو ایک نیا دھوکا کھانے، ایک نئے صحرا میں سراب دیکھنے کے لئے چھوڑ جاتی ہے۔

اگر آپ اس پر ذرا غور کریں تو نظر آ جائے گا کہ اس نئے آنے والے نے کوئی نئی بات نہیں کی، کوئی نیا وعدہ بھی نہیں کیا، وہ تو گویا تصدیق کرتا ہے کہ وعدے میرے پیشرو نے بھی انہی باتوں کے کئے تھے، اس نے پورے نہیں کئے، میں پورے کروں گا، ۲۸ سال سے یہی ہو رہا ہے۔

مشکل یہ رہی ہے کہ ہم نے ہر بار یہ تو دیکھا کہ کیا کہا جا رہا ہے، مگر یہ نہ دیکھا کہ کہہ کون رہا ہے۔ دھوکا کھانے کی بڑی وجہ ہی یہ رہی ہے کہ ہم نے محض یہ کافی سمجھا کہ بات اچھی کہی جا رہی ہے۔ دو قومی نظریہ، قومی یک جہتی، ترقی، خوشحالی، فراوانی ـــــ سب ٹھیک، مگر کس منہ سے.....؟

قرآنِ پاک سے بڑی صداقت اس کائنات میں اور کیا ہو سکتی ہے، اس نے خود اپنے مخالفین کو چیلنج دیا کہ اس جیسی ایک سورت تو بنا کر لاؤ، تم یقیناً نہیں لا سکتے، جب اسے لانے

والے سے کہا گیا کہ ہم کیسے مان لیں، یہ آپ سچ کہتے ہیں ـــــ تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم بات پر غور کرو، چیلنج قبول کرو۔ آپ نے وحی کی زبان میں فرمایا۔ فقد لبثت فی کم عمراً من قبلہ افلا تعقلون۔ میں نے اپنی زندگی تم لوگوں کے درمیان گزاری ہے، میری اس سے قبل کی زندگی پر غور کرو۔ (ایسی زندگی کسی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی)

اے سنتِ رسولؐ کے ماننے والو! غور کرو، آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم بات پر غور کرو، اسے پرکھو، دیکھو، عمل میں لاؤ، اس کی سچائی کے لئے اپنی اس سے پیشتر کی زندگی کو گواہ بنایا۔

جس وقت کوئی کسی قسم کا بھی دعوےٰ لے کر میدان میں آ جاتا ہے اس وقت تو وہ اپنی خامیاں چھپا لیتا ہے، اپنی کمزوریوں کو لوگوں کی نگاہوں تک آنے ہی نہیں دیتا ـــــ یہ لوگ جو ووٹ لینے کے لئے آپ کے پاس آتے ہیں بڑے پارسا، بڑے نیک، بڑے اصول پرست بن کر آتے ہیں، بلند بانگ دعاوی کرتے ہیں، باتیں جی لگتی کرتے ہیں، مگر کہتا ان میں سے ہر ایک یہی ہے کہ میری بات پر یقین کرو، ایک بار مجھے ایوانِ اقتدار میں پہنچا دو، میں دودھ اور شہد کی نہریں بہا دوں گا۔ ہم اس کی چرب زبانی کا دھوکا کھا جاتے ہیں ـــــ مگر اسوۂ رسولؐ ہمیں کیا سبق دیتا ہے۔ اس کی زندگی کو دیکھو، آج سے پہلے کی زندگی عمراً من قبلہٖ، آج حصولِ اقتدار کی خاطر جو نقاب وہ اوڑھ کر آیا ہے اسے اس کے چہرے سے اتار دو اور اس کے ماضی کو اپنے سامنے رکھو، دیکھو کہ یہ شخص سیرت و کردار کی پختگی کے لحاظ سے کس مقام پر ہے۔ آج تک اس نے کیریکٹر کی بلندی کا کیا کیا ثبوت دیا ہے، کن کن نامساعد حالات میں اس کا قدم نہیں لڑکھڑایا، اس نے کسی سے کوئی لین دین کیا تو اس میں پورا اترا، کسی سے کوئی وعدہ کیا تو اسے نبھایا، کسی نے کوئی امانت اس کے سپرد کی تو اس نے اس میں خیانت تو نہیں کی، کسی نے اُسے کوئی راز دیا تو وہ اس کا امین بن سکا!

میرے سامنے ووٹ بھی تو ایک امانت ہی ہے، اس امانت کے متعلق پچھلے الیکشنوں میں مجھے تو بڑا تلخ تجربہ ہوا۔ دونوں حلقوں میں، ایک جہاں میں رہتا ہوں، دوسرے جہاں میں کام کرتا ہوں۔ ایک جگہ جنہیں ووٹ دیا ان میں سے ایک پارٹی چھوڑ کر، بہت جلد دوسروں سے جا ملا، دوسرے کو پارٹی نے نکال دیا۔ اور دوسری جگہ جن لوگوں کے شانہ بشانہ میں نے کام کیا وہاں بھی ووٹروں سے پوچھے بنا ان لوگوں نے استعفےٰ دے دیا، یہ عجیب جمہوریت ہے، ایک بار ووٹ لینے کے بعد کھلی چھٹی، بعد میں ووٹروں سے پوچھنا کچھ ضروری نہیں ـــــ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے ہماری امانتوں میں خیانت کی ہے، اور خائن کے سپرد کوئی ذمہ داری نہیں کی جا سکتی۔

سو جہاں جہاں بھی آپ ہیں، جس جس پارٹی سے بھی آپ کی ہمدردی ہے، جس جس معتمد سے بھی آپ کا واسطہ پڑتا ہے، سب پر یہ واضح کر دیجئے کہ ہم بہت دھوکا کھا چکے۔ اب

ہم محض بات نہیں دیکھیں گے، یہ بھی دیکھیں گے کہ کون بات کہہ رہا ہے، اور وہ کس سیرت و کردار کا مالک ہے، ہم دیکھیں گے کہ وہ کس حد تک اپنی بات پر قائم رہ سکتا ہے اور اس کے لئے ہم اس کا ماضی اپنے سامنے رکھیں گے کہ یہی سنتِ رسولؐ ہے، یہ اسوۂ رسولؐ ہے، ہم منکرِ سنت نہیں، نہ اس کی تکذیب کرنے والوں میں ہیں، اس لئے سوچ سمجھ کر پارٹی کا امیدوار چننا۔

مجھے یقین ہے، اور یہ ساری باتیں میں اسی یقین پر کر رہا ہوں کہ اب بھی ملک میں شریف آدمیوں کی اکثریت ہے۔ اگر سارے ملک کے شریف آدمی یہ عزم کر لیں کہ آئندہ الیکشنوں میں ہم صاحبِ کردار لوگوں کو نمائندہ چنیں گے، یہ ان کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ امیدوار کے ماضی کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں تو یہ درست سمت میں پہلا قدم ہوگا ——

اگر ایسے نمائندے ایوان میں بیٹھ کر کوئی غلط بات کریں گے، کوئی غلط فیصلہ کریں گے تو ہمیں ان کی نیت پر تو شک نہیں ہو سکے گا اور پھر جب یہ بات آئین میں شامل ہے کہ یہاں کوئی قانون، قرآن و سنت کے خلاف نہیں ہوگا تو صرف ایک ایسا بااختیار ادارہ قائم کرنا باقی ہے جو اس بات کے فیصلے کا مجاز ہو کہ اس بارے میں حتمی فیصلہ کر سکے —— اس ادارے تک ہر شہری کی رسائی ہو۔ جس قانون پر اسے شک ہو وہ اسے ادارے تک فیصلے کے لئے لے جائے اور یوں آہستہ آہستہ یہاں اسلام کا عادلانہ معاشی اور معاشرتی نظام نافذ ہو کر رہے گا۔ وہی نظام —— جہاں، میں ایک بار پھر دہرا دوں۔ نہ کوئی بھوکا ہوگا، نہ ننگا۔ کوئی بے ٹھکانہ بے آسرا نہ ہوگا —— تنہا اور اجنبی نہ ہوگا۔ جہاں کے رہنے والے کو نہ خوف ہوگا نہ حزن۔ جہاں ہر شخص کی صلاحیتیں ہر قسم کی رکاوٹوں سے آزاد ہو کر، ابھر اور نکھر کر نشوونما پا سکیں گی۔

اور یوں اس خطے میں ۱۴ سو سال بعد ایک مثالی مملکت وجود میں آ جائے گی، اور یہ خطۂ زمین ایک ایسا مینارۂ نور ہوگا جسے دیکھ کر قومیں اپنی راہ متعین کریں گی۔ سمٹ مینار کی جگہ اس مینارۂ نور کی تعمیر کس قدر روح پرور، جاں فزا اور تاریخ ساز نظارہ ہوگا۔

خریداروں سے

بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ ماہ نومبر ۱۹۷۵ء سے ۱۸ روپے کر دیا گیا ہے۔ جن خریداروں کا چندہ ماہ نومبر سے پہلے وصول ہو چکا ہے ان سے مزید کوئی رقم طلب نہیں کی جائے گی۔ البتہ نومبر ۱۹۷۵ء سے اٹھارہ روپے وصول کیا جائے گا۔

(ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ لاہور)

محترم پرویز صاحب

کی زندگی کا مشن، قرآن کریم پر علم و بصیرت کی روشنی میں، غور و فکر کرنا، اور اُسے اِسی طرح قوم کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے:-

۱۔ قرآنِ کریم کا ایک ضخیم اور منفرد لغت مرتب کیا جو چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ اِس لغت کی روشنی میں پورے کے پورے قرآنِ مجید کا مفہوم مرتب کیا جو تیس پاروں (تین جلدوں) میں شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ پورے قرآنِ کریم کا انسائیکلو پیڈیا (تبویب القرآن) مرتب کیا، جو کتابت و طباعت کے مراحل طے کرنے کے بعد متعدد ضخیم جلدوں میں شائع ہوگا۔

۴۔ قریب پینتیس سال سے، قرآنِ مجید کے مختلف موضوعات پر درجنوں نادر تصانیف شائع کر رہے ہیں۔

۵ قریب بیس سال سے مسلسل درسِ قرآن دے رہے ہیں۔

اور اب

انہوں نے، اس تمام تحقیق و کاوش کی روشنی میں، قرآن مجید کی تفسیر، خود قرآن مجید سے، ——— کے مبارک سلسلہ کا آغاز کر دیا ہے جس کی پہلی جلد

مطالب الفرقان

کے نام سے سابقہ کنونشن کی تقریب پر شائع کی گئی ہے۔ چونکہ یہ تفسیر اُن کی عمر بھر کی تمناؤں کا حاصل، اور فکری کاوشوں کا منتہیٰ ہے، اس لئے اُسے شائع بھی نہایت ذوق و شوق سے کیا گیا ہے۔ ——— سفید پرنٹنگ پیپر ——— آفسٹ کی چھپائی ——— حسین مطلا جلد ——— ضخامت (۳۸۸) صفحات ——— قیمت فی جلد چالیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) ادارۂ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش، اردو چوک لاہور

(بقیہ صفحہ ۱۵ سے آگے) کے ٹیپس پر ریکارڈ شدہ درسِ قرآن کو ضبطِ تحریر میں لانے کی مساعیٔ جمیلہ کو مستقل مزاجی سے اب تک جاری رکھا ہے۔ کنونشن کا یہ اجلاس موصوف سے بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کارِ فیض کو بدستور جاری رکھیں گے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم	**لاہور** ہر اتوار ۹ بجے صبح (فون ۸۰۸۰۰) ۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن)
لائلپور ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) ۶۵ کوتوالی روڈ　حیات سرجری کلینک فون ۴۲۹۴	**ملتان** ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ ستر بیرون پاک گیٹ فون ۲۰۷۱
سیالکوٹ ہر اتوار ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) چوہدری محمد دین کی سٹال کرسچن ٹاؤن بارہ پتھر	**کراچی** ہر اتوار ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام دار القائد ۲۰۔ اے آر بی ناظم آباد ۳ فون ۶۱۰۴۶۸
راولپنڈی ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶۔ لیاقت روڈ	**گجرات** ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ۔ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام۔ بمقام ۱۲/۱/۱ بی جمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

باسمہٖ تعالیٰ

وہ ہمارا خواب تھا ——

—— یہ خواب کی تعبیر ہے

(طلوعِ اسلام کنونشن، منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۵ء

سے پرویز صاحب کا خطاب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

وُہ ہمارا خواب تھا ــــ یہ خواب کی تعبیر ہے

برادرانِ گرامی قدر! السلام علیکم

ملتِ اسلامیہ کے ایک عظیم مفکرؒ نے، جس نے اپنے آپ کو بجا طور پر "دیدۂ بینائے قوم" کہا تھا، ایک نہایت حسین خواب دیکھا، جسے اُس نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر ان الفاظ میں اپنی قوم ہی نہیں، بلکہ ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ:

> ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اُسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اِسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں، یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اِس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا..... اس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔) اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے..... اِس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور اُنہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔

(خطبۂ صدارت علامہ اقبالؒ۔ مسلم لیگ سیشن ۱۹۳۰ء)

اس اعلان نے فضا میں تھرتھری پیدا کر دی۔ اُس وقت تک اسلام کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے۔ اور مذہب کے متعلق تصور یہ تھا کہ

وہ خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ روحانی تعلق کا نام ہے۔ امورِ مملکت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام کے متعلق اس غلط فہمی میں اپنے اور بیگانے، قریب قریب، سبھی مبتلا تھے۔ انہوں نے پہلی بار سنا کہ اسلام اسی صورت میں ایک زندہ حقیقت بن سکتا ہے جب اُس کے پیروؤں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ جس میں وہ اِس قابل ہوں کہ آزادانہ اسلام کی ابدی اقدار پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اس وقت غیر منقسم ہندوستان میں آزادی کی تحریک جاری تھی جس سے مراد یہ تھی کہ زمامِ اقتدار انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر پورے ہندوستان میں ایک آزاد مملکت قائم کر لی جائے۔ اور اُس مملکت میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو ـــــ یعنی اُسی قسم کے اسلام کی آزادی، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ آزادی کا یہ تصور عوام ہی کا نہیں تھا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے اکابرین، حتیٰ کہ ان کے علمائے کرام تک اِسی کے حامی تھے اور اس آزادی کے حصول کی کوششوں کو جہادِ عظیم کہہ کر پکارتے تھے۔ بنا بریں، مسلمانوں کے لئے آزادی کا جو تصور اقبالؒ نے پیش کیا، اس کی، اور تو اور، ان علماء کی طرف سے بھی سخت مخالفت ہوئی اور انہی کے ساتھ علامہ اقبالؒ کو سب سے بڑی جنگ کرنی پڑی۔ اِس سلسلہ میں ان کا جو معرکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ ہوا، وہ تاریخ کے صفحات میں ایک ابدی حقیقت کے طور پر منضبط ہے۔ مولانا مدنیؒ کا مسلک یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے بعد وہاں مغربی اندازِ جمہوریت کی حکومت قائم کر دی جائے، جس میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔ علامہ اقبالؒ کا مؤقف یہ تھا کہ آزادی کا یہ تصور ہندو کا تو ہو سکتا ہے، مسلمان کا نہیں جہاں تک ملک کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کا سوال ہے، اس میں مسلمان برابر کے شریک ہیں، لیکن اِن کے نزدیک یہ آزادی نہیں بلکہ آزادی کے حصول کا ذریعہ یا اُس کی منزلِ اوّل ہے۔ اِن کے تصورِ آزادی کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب انہیں اس امر کی آزادی

مسلمانوں کی آزادی

ہو کہ وہ اپنے ہاں اِسلامی حکومت قائم کر سکیں ـــــ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب بلا شرکتِ غیرے ان کی اپنی جداگانہ مملکت ہو۔ چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے چند ہی ماہ پہلے (۱۹۳۸ء میں) مولانا مدنیؒ مرحوم کے اعتراض کے جواب میں فرمایا تھا:۔

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اوّلیں مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔ اِس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں اُنہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا، چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ

چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ویسا ہی رہے، یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں، لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

(علامہ اقبالؒ کا بیان موسوم بہ "معرکۂ دین و وطن")

نیشنلسٹ علماء کا یہ نظریہ بھی تھا کہ ایک وطن کی حدود کے اندر بسنے والے تمام لوگ بلاتفریقِ مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ قوم ہے جس کی مشترکہ حکومت اس ملک میں قائم ہوتی ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ہندوستانی قوم کے اجزاء ہیں اور اس لئے ان کی جداگانہ مملکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے کہا کہ قومیت کا یہ نظریہ بھی سراسر باطل اور قرآنی نظریۂ قومیت کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے قومیت کا معیار دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا۔ اس لئے کسی ملک کے اندر رہنے والے مسلمان محض اشتراکِ وطن کی بنا پر وہاں کی غیر مسلم آبادی سے مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اس بنا پر بھی اپنی الگ مملکت قائم کرنے کے حقدار ہیں۔ انہوں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے جواب میں کہا کہ:-

اسلامی نظریۂ قومیت

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو، آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول اللہؐ نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیتِ وطنی قائم رکھی ..... محمدؐ (فداہ ابی و امّی) کی قوم آپؐ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمدؐ کی اُمت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہؐ کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام کے، وہ سب اُمتِ مسلمہ یا ملّتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے۔ اب ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا ..... حضورؐ رسالتمآب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بُت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا

> سکتی ہے۔ لیکن حضورؐ (نعوذ باللہ) اگر یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ نبیٔ آخرالزمان کی راہ نہ ہوتی۔
>
> (معرکۂ دین و وطن)

علامہ اقبالؒ نے اِس حقیقت کو بھی متعدد بار واضح کر دیا کہ ہم جو کہتے ہیں کہ اسلام میں قومیت کا مدار دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا، اور یہ کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اسی صورت میں بن سکتا ہے، جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو، تو کوئی شخص اس زعمِ باطل میں گرفتار نہ رہے کہ ہم اِن نظریات کو محض حصولِ اقتدار کے لئے بطور حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے دین کی ابدی اور غیر متغیر حقیقتیں ہیں، جنہیں بدقسمتی سے مسلمانوں نے فراموش کر دیا تھا—میں اُنہی کی یاددہانی کرا رہا ہوں۔ اسی بنا پر انہوں نے فرمایا:۔

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ، اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔
>
> (معرکۂ دین و وطن)

یہ تھا وہ خواب، جو اِس دیدہ ور نے دیکھا، اور اُسے دنیا کے سامنے ایسے واشگاف الفاظ میں پیش کیا۔ اقبالؒ اِس حقیقت سے بھی ناآشنا نہیں تھا کہ ایک مفکرؔ صحیح نظریات پیش کر سکتا ہے۔ اُن نظریات کو عملی پیکروں میں ڈھالنا سیاسی مدبّرین کا کام ہوتا ہے۔ بنابریں انہیں کسی ایسے مدبّر کی تلاش تھی جو اِس عظیم مقصد کے حصول کا اہل بھی ہو اور انتہائی قابلِ اعتماد بھی۔ یہ بھی اقبالؒ کے کردار کی عظمت کا ثبوت ہے، ورنہ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ نام نہاد بڑے لوگ، یہ جاننے کے باوجود کہ وہ فلاں کام کے اہل نہیں، محض بڑا بننے کی ہوس میں اس کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کو جو عالمگیر شہرت حاصل تھی اور ملّتِ اسلامیہ کے دل میں بالخصوص ان کے لئے جو جذبۂ احترام موجزن تھا، اگر وہ بھی اِس قسم کی پوزیشن اختیار کر لیتے تو ان پر کوئی بھی معترض نہ ہوتا۔ لیکن ان کے جذبہ میں صداقت تھی، اس لئے انہوں نے ایسا نہیں کیا، اور کسی ایسی شخصیت کو تلاش کرتے رہے جو اس کی اہل ہو۔ اور بالآخر ان کی یہ

جناحؒ کو ڈھونڈ نکالا

تلاش کامیاب ہو گئی۔ دنیائے سیاست کی فراست آج تک محوِ حیرت ہے کہ اس تلاش میں اُن کی نگاہ، جا کر ٹکی تو کس شخصیت پر—اس شخصیت پر جس کے متعلق اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایمان کی بنیادوں پر جداگانہ قومیت اور اسلام کے احیاء کے لئے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے نظریہ کو اپنا سکے گا، اور نہ صرف اپنا سکے گا، بلکہ اُسے کامیابی کی آخری منزل تک بھی پہنچا دے گا۔

بمبئی کے بیرسٹر مسٹر محمد علی جناحؒ بہت بڑے لیشلسٹ تھے۔ عمر بھر ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار رہے، اور جب اپنی کوششوں میں ناکام رہ گئے تو مایوسی کے عالم میں وطن کو چھوڑ کر سات سمندر پار انگلستان کے ایک گوشۂ تنہائی میں خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ علامہ اقبالؒ کی نگاہِ متجسس جا کر اس شخصیت پر ٹکی۔ چنانچہ انھوں نے مسٹر جناحؒ سے رابطہ قائم کیا اور ایک عرصہ کی جد و جہد کے بعد ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو انہیں وہ خط لکھا جو اُن کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ:-

> مَیں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف انسان ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ (میرے اِس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اِس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اِس طوفان میں، جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک پہنچائیں گے۔
> (قائدِاعظمؒ کی سوانحعمری۔ مؤلفہ ہیکٹر بولیتھو۔ صفحہ ۱۱۵)

یہ تیر اقبالؒ کے قلب سے نکلا اور سیدھا جناحؒ کے دل میں پیر گیا۔ اقبالؒ نے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ قرآنی نظریات کی یہ شمعِ فروزاں جناحؒ کے ہاتھ میں تھما دی جسے ملت نے بجا طور پر "قائدِاعظمؒ" کہہ کر پکارا۔ اقبالؒ کے بعد دین اور وطن کی یہ جنگ، قائدِاعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے مخالفین کے درمیان ٹھن گئی ان میں انگریز، ہندو، کانگریسی مسلمان — سیاسی لیڈر اور نیشلسٹ علماء سب شامل تھے۔ اور مسٹر گاندھی اس زمانہ میں اس متحدہ محاذ کا سربراہ تھا۔ مسٹر گاندھی نے قائداعظمؒ کو لکھا کہ آپ دین کو قومیت کا معیار کیسے قرار دیتے ہیں اور مذہب کو سیاست میں کیوں گھسیڑ رہے ہیں۔ اِس کے جواب میں قائداعظمؒ نے اُسے یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو ایک خط لکھا، جس میں کہا کہ:-

> آج آپ اِس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست؟ بازگرانی اصلاح تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے۔) آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان سے واسطہ نہیں، میں اُسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے

اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں، محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے، لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(تقاریرِ جناحؒ۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۳۹-۱۴۰)

جہاں تک دو قومی نظریہ کا تعلق ہے، انہوں نے مسلم لیگ کے مدراس سیشن (۱۹۴۱ء) کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا..... ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم نے اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہنا ہے۔ اس باب میں کسی کو، کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۸۰)

مسٹر گاندھی نے انہیں ایک خط میں لکھا کہ:۔

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ، جنہوں نے اپنے آباد اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباد اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں ــــ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اُسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے، خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔ (مکتوب مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء)

اسی قسم کے تھے وہ اعتراضات، جن کے پیشِ نظر قائدِاعظمؒ نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۴۳ء کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ:۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندو مت کی حقیقت اور اصلیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں ــــ یہ حقیقت ہے کہ دونوں "مذہب" نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے! ہندو اور مسلمان زندگی کے ہر معاملہ میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے ــــ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر قائم

ہیں۔ دو ایسی قوموں کا ایک نظامِ حکومت میں جکڑ دینا، باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کے لئے وضع کیا گیا ہو۔ (تقاریر جناحؒ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۷۸-۱۷۷)

ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ جب علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصوّر پیش کیا تھا تو انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ اس سے اتنا ہی مقصد نہیں کہ ہمیں ایک خطۂ زمین مل جائے جس میں ہم اپنی آزاد مملکت قائم کر لیں۔ اس سے حقیقی مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی مملکت وجود میں آ جائے، جس میں اسلام پھر ہو ہی زندہ حقیقت بن جائے، جس طرح وہ صدرِ اوّل میں بنا تھا۔ قائدِ اعظمؒ بھی جہاں غیروں کے ساتھ چومکھی لڑائی لڑتے تھے، خود اپنی قوم کے دل میں اس حقیقت کو راسخ کئے جاتے تھے کہ اس جد و جہد سے مقصود دنیا کی اور قوموں کی طرح ایک آزاد مملکت قائم کرنا نہیں۔ بلکہ اس سے مقصود اسلام کا احیاء ہے، جو اپنی مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ مثلاً انہوں نے ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین، علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے، بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۶۷)

اُن کے نزدیک اس مقصد اور نصب العین کی کس قدر اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے کہا:

ہماری حفاظت، نجات اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ اگر ہم اس جد و جہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تو تباہ ہو ہی جائیں گے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس برصغیر میں نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے گا، نہ اسلام کا نام و نشان۔ (تقاریر جناحؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۵)

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ اُن کے نزدیک مملکتِ پاکستان کا مقصود کیا تھا اور اُس کی اہمیت کس قدر۔

فریقِ مخالف تو ایک طرف، اُن سے خود اُن کے رفقاء بھی رہ رہ کر پوچھتے کہ مسلمانوں میں اس وقت اس قدر اختلافات ہیں۔ یہ انہیں مٹا کر کس طرح ایک امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھل جائیں گے؟ اس کے جواب میں انہوں نے ۱۳ نومبر ۱۹۴۵ء کو پیغامِ عید کی نشری تقریر میں فرمایا کہ:

جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکیں گے۔ (تقاریر جناحؒ۔ جلد اول صفحہ ۱۰۸)

انہوں نے کراچی مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۳ء میں اسی اجمال کی تفصیل بڑے بلیغ انداز میں فرمائی۔ انہوں نے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ:۔

> وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے .....؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب اِن الفاظ میں دیا:۔

> وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتابِ عظیم قرآنِ مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ، فلہٰذا ایک قوم۔ (تقاریرِ جناحؒ جلد دوم۔ صفحہ ۵۰)

اس سے آپ نے دیکھا کہ قائدِاعظمؒ کے نزدیک بھی نہ صرف یہ کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے تھے، بلکہ خود مسلمانوں کے اندر بھی اتحاد ہی نہیں بلکہ وحدت کا بھی یہی ذریعہ تھا۔ اور یہی اسلام کا بھی مقصود ہے۔ انہوں نے ان تمام حقائق کو ایک مقام پر اس حسن و خوبی سے یکجا کر دیا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اُسے مملکتِ پاکستان کے آئین کی بنیاد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ہوا یہ کہ قائدِاعظمؒ ۱۹ اگست ۱۹۴۷ء کو حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ وہاں بعض نوجوان طلباء نے ان سے کچھ سوالات کئے۔ اس مکالمہ کو مسٹر محمود علی بی اے (عثمانیہ) نے محفوظ کر لیا۔ اور نیٹ پریس کی وساطت سے یہ اخبارات میں شائع ہوا اور طلوعِ اسلام نے اسے مارچ ۱۹۴۲ء کے پرچہ میں شائع کیا۔ یہ انٹرویو بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ اسے بار بار سامنے لایا جائے۔ آپ بھی توجہ سے سنیئے:۔

اِسلامی مملکت کا امتیازِ خصوصی

سوال:۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقیّد مفہوم یا تصوّر نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی

پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال :۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب :۔ اشتراکیت، بالشویت یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک دراصل اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سارا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال :۔ ترکی حکومت تو ایک مادی حکومت (سیکولر اسٹیٹ) ہے۔ کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ آپ کا اس باب میں کیا خیال ہے؟

جواب :۔ میرے خیال میں ترکی حکومت پر مادی حکومت کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز، سو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کے لئے تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

سوال :۔ وہ مملکت ہمیں ہندوستان میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے؟

جواب :۔ مسلم لیگ، اس کی تنظیم، اس کی جدوجہد، اس کا رُخ، اس کی راہ سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال :۔ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک، ٹوک بروئے کار اور رو بہ ترقی لا سکیں، تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟

جواب :۔ وقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت، بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی

حدود کیا ہیں، اِن امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے، اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اِس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی — حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں ہیں، ان مولوی صاحبان میں (الّا ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

آپ اس مکالمہ کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ قائدِاعظمؒ کے تصور میں اُس پاکستان کا کیا نقشہ تھا، جس کے لئے وہ اِس قدر تن دہی اور جانفشانی سے مصروفِ کار تھے۔ اسی زمانہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ جب بقول قائدِاعظم، مولوی صاحبان میں نہ اِس کی صلاحیت تھی، نہ اس کی استعداد کہ وہ امورِ مملکت کو سمجھ بھی سکیں تو پھر اُن کے ذہن میں وہ کون سا طریق تھا جس سے وہ اس مملکت کو حقیقی معنوں میں اسلامی بنانا چاہتے تھے۔ اس سوال کا اجمالی جواب تو خود اس انٹرویو کے ایک ایک فقرہ کے اندر موجود ہے۔ یعنی یہ کہ اِس میں قرآن کریم کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کریں گے۔ لیکن اس کی تفصیل انہوں نے کئی دیگر مقامات پر بھی بتائی۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں ملّت کے نام، عید کے پیغام میں اِس کی وضاحت اِن الفاظ میں فرمائی۔

> اِس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام، مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحرالظلمات سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اِس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جو نوعِ انسان کے تمام اعمال و احکام کو محیط ہیں اور جو غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اِس کے بعد قائدِاعظمؒ نے کہا۔

> اِس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا، عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرۃ کے مواخذہ کا۔ اِن سب کے لئے اِس میں قوانین

موجود ہیں۔ اِسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔

(تقاریر جناحؒ۔ جلد دوم۔ صہ ۳)

تھیاکریسی کے خلاف

اِس سے واضح ہے کہ قائدِاعظمؒ کے تصور میں یہی تھا کہ مملکتِ پاکستان کا بنیادی دستور قرآنِ کریم ہوگا۔ اور ملتِ پاکستانیہ باہمی مشاورت سے یہ طے کرے گی کہ اس کے اصول و اقدار و احکام کو بحالاتِ موجودہ نافذ کرنے کا کیا طریق ہو۔ اِس لئے اُنہوں نے بار بار اس کی وضاحت کر دی کہ یہاں تھیاکریسی قائم نہیں ہوگی۔ چنانچہ اُنہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں بحیثیت گورنر جنرل اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا تھا۔

> پاکستان کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اِس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار، جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اُسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں، جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اِسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی، جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ صہ ۶۵)

مجوزہ مملکتِ پاکستان کے خلاف عام طور پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا تھا کہ اس میں ایک مملکت دو ایسے حصوں پر مشتمل ہوگی جن میں قریب ایک ہزار میل کا فاصلہ ہوگا۔ اِن میں نظم و ضبط اور رابطہ اور واسطہ کا ذریعہ کونسا ہوگا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان

قائدِاعظمؒ نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈکاسٹ میں پہلے یہ فرمایا:۔

> مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے قریب ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال اُبھرے گا وہ یہ ہوگا کہ ایسی مملکت کا قیام کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی، مَیں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں

دوں گا۔ اور وہ یہ کہ ایسا ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان اپنے مستقبل پر۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں، وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اِس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔

اِس کے بعد انہوں نے فرمایا:۔

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اُس اسلامی برادری کے ارکان ہیں، جن میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساسِ دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (ان بنیادوں پر ہم ایک قوم بنتے ہیں۔)

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل صفحہ ۵۸)

آپ نے بعض ایسے لوگوں کو جو اپنے دِل میں مملکتِ پاکستان اور اس کے معمار، قائدِ اعظمؒ کے کے خلاف خبثِ باطن رکھتے ہیں، یہ کہتے سنا ہوگا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران قائدِ اعظمؒ نے اسلام کا نام محض ایک وکیلانہ حربہ کے طور پر لیا تھا۔ درحقیقت ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گی۔ اُن کے تصور میں اس کا نقشہ ایک سیکولر اسٹیٹ ہی کا تھا۔ آپ سنیئے کہ انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد بحیثیت گورنر جنرل اکتوبر ۱۹۴۷ء میں خالق دینا ہال کراچی میں، حکومتِ پاکستان کے افسروں سے اپنے اوّلیں خطاب میں کیا فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:۔

پاکستان کا قیام، جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے، جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں۔ اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رو بہ عمل لائے جا سکیں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۲۲

یہ تھا عزیزانِ من! وہ حسین خواب، جسے ہم نے غیر منقسم ہندوستان کی شبِ تیرہ و تار میں دیکھا تھا۔ خود قائداعظمؒ نے اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا کہ "پاکستان جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین خوابوں کی تعبیر ہے، پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آ گیا۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔"

خواب کی تعبیر

یہ تھا ہمارا خواب۔ اب اس خواب کی تعبیر دیکھئے۔ مگر دیکھنے کے لئے آپ کو جگہ مقام کر بیٹھنے کی ضرورت ہو گی، اس لئے کہ ؎

ہم اپنی روداد کیا سنائیں، کچھ اس میں ہیں واقعات ایسے
اگر کوئی دوسرا سناتا، ہمیں سمجھتے اسے فسانہ!

پاکستان کا حسین خواب حریر و اطلس کے دو نرم و نازک دھاگوں سے بُنا گیا تھا۔ ایک یہ کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیادوں پر غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں، اور دوسرا یہ کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گی، جس کا بنیادی دستور خدا کی عظیم کتاب قرآنِ کریم ہو گا۔ اب یہ دیکھئے کہ ہم نے اِس تانے بانے کے ساتھ کیا کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

مملکتِ پاکستان کی بنیاد اِس دینی حقیقت پر تھی کہ غیر مسلم اور مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ قائداعظم تشکیلِ پاکستان کے بعد صرف ایک برس تک زندہ رہے، اور وہ بھی صدہا قسم کے مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے اور گوناگوں عوارض کا شکار۔ اُن کی وفات کے بعد دنیا یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ گئی کہ خود حکومتِ پاکستان نے اپنی مملکت کے اِس بنیادی ستون کو اپنے ہاتھوں سے ڈھا دیا۔ وہ اِس طرح کہ انہوں نے اِس مملکت کی حدود کے اندر بسنے والے مسلمان اور غیر مسلموں کو اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم تسلیم کر لیا۔ اس سے اس مملکت نے خود اسلام کے ایک بنیادی اصول سے جس طرح انحراف کیا، اُسے تو چھوڑیئے، دیکھئے یہ کہ اِس سے اس کی سیاست پر کیا اثر پڑا؟ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی کم و بیش ڈیڑھ کروڑ تھی۔ وہ ایک خاص منصوبے کے تحت وہیں رہ گئے، ہندوستان کی طرف منتقل نہیں ہوئے۔ اِس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ انہوں نے وہاں کے مسلمان بنگالیوں کے ذہن میں یہ خیال ابھارنا شروع کر دیا کہ تمہاری آبادی مغربی پاکستان کی آبادی کے مقابلہ میں زیادہ ہے، لہٰذا جمہوریت کی رُو سے مملکتِ پاکستانیہ کی زمامِ اقتدار تمہارے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ اکثریت اور اقلیت کا یہ سوال بجائے خویش نظریۂ پاکستان یا اسلام کے تصور کے خلاف تھا۔ جب (کم از کم) ایک ملک میں رہنے والے تمام مسلمان ایک قوم یعنی امتِ واحدہ ہوں تو ان کے اندر اکثریت اور اقلیت کا سوال کیا! یہ تفریقی لعنت تو مغربی نظامِ جمہوریت کی پیدا کردہ ہے، جس میں قوم سیاسی پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے اور جو پارٹی

کسی طرح عددی اکثریت حاصل کر لے، زمامِ اقتدار اس کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ اور دوسری پارٹیوں کو اس کا حق دے دیا جاتا ہے کہ وہ اِس پارٹی کے خلاف ایجی ٹیشن کرتی رہیں، اور یوں قوم کے انتشار، خلفشار اور فساد کے جراثیم پرورش پاتے رہیں۔ اس مقام پر میں آپ کی توجہ ایک اور دلچسپ حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ انگلستان میں جمہوری نظام رائج ہے۔ وہاں اکثریت اور اقلیت کا سوال ایوانِ پارلیمان کے اندر تک محدود ہے۔ ملک میں مذہب کی بنیادوں پر اکثریت اور اقلیت کا کوئی سوال نہیں۔ وہ سب ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ جمہوری نظام، بھارت میں بھی رائج ہے۔ لیکن وہاں ایک اکثریت، اقلیت پارلیمان کے اندر ہے، اور دوسری اکثریت، اقلیتِ عام ملک کے اندر۔ یعنی ہندو، اکثریت اور غیر ہندو (مسلمان، عیسائی وغیرہ) اقلیتیں۔ ہم نے اپنے ہاں نظامِ جمہوریت بھی رائج کیا، تو بھارت کے نمونے کا، جس کی رُو سے، ایک اکثریت اور اقلیت، پارلیمان کے اندر ہے۔ دوسری اکثریت۔ اقلیت، بربنائے مذہب، ملک کے اندر — اور پھر ان دونوں پر مشتمل پاکستانی قوم — یعنی اس میں دین کے ایک مسلّمہ، اور مطالبۂ پاکستان کی بنیاد سے انحراف تو ایک طرف، خود نظامِ جمہوریت کی بھی نفی ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم سوچنا چھوڑ دے تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ بہرحال ہمارے ہاں نظامِ جمہوریت اختیار کر لیا گیا۔ حتیٰ کہ اقامتِ دین کی علمبردار ہونے کی مدعی جماعتوں تک نے اِسے اسلامی قرار دے دیا۔

مشرقی پاکستان میں ہندو

مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے پیشِ نظر مقاصد کے لئے یہ نظام بڑا سازگار تھا۔ اس کے ساتھ ہی اِس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی صرف تعداد ہی اتنی کثیر نہ تھی، وہ وہاں کی مسلمان آبادی کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے دستِ غالب کی حیثیت رکھتے اور زندگی کے ہر شعبہ پر چھائے ہوئے تھے۔ تجارت، سیاست، اقتصادیات، معاشرت، حتیٰ کہ تعلیم تک کا ہر گوشہ ان کے زیرِ اثر تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہاں اسلامیات کے مدرّس بھی ہندو تھے۔! نتیجہ اس کا یہ کہ وہ خطۂ زمین، حصّہ تو مملکتِ پاکستان کا تھا لیکن حکومت وہاں بھارتی ہندوؤں ہی کی تھی۔ مشرقی پاکستان سے نیچے اتر کر قریب قریب بھی پوزیشن سندھ کی تھی، وہاں بھی ہندو بڑی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔

انگریز کے زمانے میں سارے ہندوستان کا نظام ایک حکومتی تھا جس میں اقتدار کا سرچشمہ مرکزی حکومت تھی۔ انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر ملک کو ضلعوں، کمشنریوں اور صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس وقت صوبوں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ پاکستان میں بدقسمتی سے ایسی فضا پیدا کر دی گئی جس میں مختلف صوبوں نے اپنے آپ کو الگ الگ حکومتیں سمجھنا شروع کر دیا — حکومتیں ہی نہیں بلکہ الگ الگ

صوبائی تفریقات

قومیتیں — اِس احساس کے آثار بھی اولاً مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے شروع ہوئے اور اتنی جلدی کہ وہاں زبان کے اختلاف کی آڑ میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں فسادات شروع ہو گئے، اور حالات ایسی نزاکت اختیار کر گئے کہ خود قائداعظمؒ کو وہاں جانا پڑا۔ یہ شروع ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ وہ وہاں قریب نو دن ٹھہرے۔ واپسی پر انہوں نے وہاں کے رہنے والوں کے نام ریڈیو سے ایک الوداعی پیغام نشر کیا، جس کے دوران فرمایا:۔

> پاکستان، مسلم قومیت کی وحدت کا مظہر ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ ہمیں حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے اِس وحدت کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم نے اپنے آپ کو اولاً بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ کی حیثیت سے سمجھنا شروع کر دیا، اور مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت محض اتفاقیہ تصور کر لی گئی تو پھر پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ یہ نہ سمجھیئے کہ یہ کوئی بعید از قیاس اور ناقابلِ فہم سا مسئلہ ہے۔ ہمارے دشمنوں کو اس کے امکان کا اچھی طرح اندازہ ہے، اور انہوں نے ابھی سے اِس کے لئے بساط بچھانی شروع کر دی ہے۔ میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا سوچیئے کہ جب سیاسی ایجنسیاں اور ہندو پریس، جس نے تشکیلِ پاکستان کی انتہائی مخالفت کی تھی، مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے مزعومہ "منصفانہ حقوق" کا درد دل میں لے کر اٹھیں، تو کیا یہ ایک انتہائی شرانگیز چال نہیں ہو گی۔ کیا اس سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے نہیں آ جاتی کہ یہ عناصر تخلیقِ پاکستان کی مہم میں ناکام رہ گئے تو اب انہوں نے اِس کے اندر انتشار پیدا کر کے اِسے ختم کرنے کی ٹھان لی ہے اور اس کے لئے ایسا شرانگیز پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے، جس سے ایک مسلمان بھائی دوسرے بھائی کے خلاف لڑنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

پاکستان دشمن عناصر کی اِن شرانگیزانہ سازشوں کا وجود تھا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان اِن کا شکار کیوں ہونے لگ گئے؟ اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ ہم ہندوستان سے مسلم قومیت اور پاکستانی آئیڈیالوجی کے نظریات لے کر تو ضرور آئے تھے، لیکن ان کی بنیادوں پر ایک اُمت نہیں بن پائے تھے۔ نہ ہی ہم نے اس کا احساس کیا تھا کہ یہی ہماری مملکت کے ستون اور ہمارے جداگانہ تشخص اور وجود کی وجۂ جواز ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران نہ اتنا وقت تھا، نہ اتنی فرصت کہ ہم ایسا کر سکتے۔ یہاں آنے کے بعد میں نے اس

کا احساس کیا، قرآنِ کریم کی روشنی اور قوموں کی نفسیات کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا علاج، اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے نصاب و نظامِ تعلیم کو یکسر بدل دیں تاکہ ہماری آنے والی نسلوں کی ذہنی اور قلبی تربیت اس انداز کی ہو کہ وہ ان نظریات کی حامل قوم بن کر اُبھرے۔ یہاں جو حضرات برسرِ اقتدار تھے، اسے حسنِ اتفاق سمجھئے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران، ہم قافلہ ہونے کی وجہ سے، اُن میں سے اکثر کے ساتھ میرے مراسم یا کم از کم تعارف تھا۔ اس لئے ان تک مجھے باریابی حاصل تھی۔ میں نے اُن میں سے ایک ایک پر اس تبدیلی کی اہمیت واضح کی اور اس مقصد کے لئے بلا مزد و معاوضہ اپنی حقیر سی خدمات بھی پیش کر دیں۔ وہ نظری طور پر اس سے اتفاق کرتے رہے، لیکن ہماری بدقسمتی کہ عملاً اُن میں سے کسی نے بھی کچھ نہ کیا۔ نتیجہ اُس کا یہ کہ ہماری آنے والی نسل، جسے ہمارے دیکھتے دیکھتے ملّتِ پاکستانیہ بن جانا تھا، بے راہ روی کی اسی قدیم فضا میں پرورش پاتی رہی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، مشرقی پاکستان کی نئی نسل کا ملتا ہندوؤں کی گرفت میں تھی۔ وہاں کا پورا نظامِ تعلیم اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اس تعلیم نے وہاں کس قسم کے نوجوان پیدا کئے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک اُس خط سے سامنے آ جاتی ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم اے فائنل کے طالب العلم عزیز الرحمٰن نے روزنامہ ـــــ (DAINIC PAKISTAN) کی ۷ رمئی ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع کیا تھا..... اس خط کا اُردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے:۔

تعلیمی انقلاب کا تصوّر

اس تعلیم کے برگ و بار

> ۱۹۴۷ء میں، تشکیلِ پاکستان کے ساتھ مغربی پاکستان کی طرف سے جو لہر ہماری طرف آئی تو اس سے ہم نے اپنے بنگالی تشخص کو فراموش کر دیا۔ پنجابیوں، سندھیوں اور بہاریوں کے ساتھ خلا ملا کی وجہ سے ہم اس قدر بے وقوف بن گئے کہ ہم نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ ہم اولاً مسلمان ہیں اور اُس کے بعد بنگالی، بہاری، پنجابی وغیرہ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سامراج ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ (جس کے نتیجہ میں پاکستان، بھارت سے علیحدہ ہو گیا تھا۔) لیکن آج ہمیں قدرے اطمینان کا سانس لینا چاہیئے کہ مختلف اداروں کی کوشش سے خوابیدہ بنگالیوں میں حرکت کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ ہم شری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسےٰ اور (معاذ اللہ) علی حبیبوں کو اپنا ہیرو سمجھنے میں فخر محسوس کرنے لگ گئے تھے۔ ہم اپنے بچوں کا نام

> اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں لکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیرملکی خدا ـــــ اللہ ـــــ کو اپنا معبود تصور کر لیا تھا۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے تھے اور ناگن اور کھاگن جیسے سیدھے سادھے ناموں کو تیاگ بیٹھے تھے۔ یہ سب ان رنگین چشموں کا نتیجہ ہے جسے باہر سے درآمد کیا گیا ہے۔ ..... لیکن اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مشرقی بنگال کی اس روش کے نتیج میں مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں، اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔ اگر ہم اسی طریق سے اپنے دیگر اہلِ وطن کے خیالات کو بھی متاثر کرتے رہے کہ وہ جغرافیائی اور لسانی قومیت کو اسلامی قومیت پر ترجیح دیں تو مغرب کی عیسائی قوموں نے ترکوں کی خلافت کو تباہ کر کے جو کچھ حاصل کیا تھا، ہم اس سے بھی زیادہ حاصل کر لیں گے۔
>
> (طلوع اسلام۔ بابت اپریل ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۰)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مشرقی پاکستان کے بعد مغربی پاکستان میں ہندو مقابلتاً سندھ میں زیادہ اثر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عزیز الرحمٰن نے یہ کہا تھا کہ بنگالیوں کی طرح یہی جذبات سندھیوں میں بھی بیدار ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں کے ان اثرات اور غلط نظامِ تعلیم نے سندھ میں کس قسم کی نئی تعلیم یافتہ نسل کو جنم دیا ہے اس کا اندازہ ایک سندھی طالبہ مس نسیم مغل کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ "حریت" کی ہفتہ وار اشاعت بابت ۲۴ رنومبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس طالبہ نے لکھا یہ تھا:-

> وہ اسلام اور پاکستان، جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجو دارو، کوٹ ڈجی جہان کے آثارِ قدیمہ، اور لطیف، سچل، ایاز، جی۔ایم۔سیّد کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے

عظیم ہے۔ (نہ کہ اسلام کی وجہ سے) (طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۶۸ء)

اور آگے بڑھیئے۔ مشرقی پاکستان کے ۱۹۷۱ء کے المیہ کے بعد اور اُس قیامتِ صغریٰ کے پیشِ نظر جو وہاں کے "بہاری" (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر گزری، سندھ کی ایک ادیبہ —— غزالہ بلوچ —— کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی ۱۹ر اگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اُس نے لکھا تھا:۔

> اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پُرمسرت حالت میں ہوتے، لیکن اُنہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان، ایک پاکستان، کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے۔ اور اب اپنی حماقت کی قیمت اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اس دن شروع ہوتی ہے جب انہوں نے ۱۹۴۶-۴۷ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو وہ آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گذار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر، ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے، تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔ (طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء صفحہ ۴۳)

یہ تھا اُس تعلیم و تربیت کا نتیجہ جو ہماری درسگاہوں میں ہماری نئی نسل کو دی جا رہی تھی۔ جیسا کہ مَیں نے پہلے کہا ہے، میں اِن تمام فظائر کو اربابِ حل و عقد کی خدمت میں پیش کرتا رہا۔ ان میں سے بعض حضرات کی کشادہ نگہی مجھے نرم گرم باتیں کرنے کی بھی جرأت دلا دیتی تھی۔ مَیں اُن سے دانشگاف الفاظ میں کہتا کہ آپ پاکستان کی بہبود اور ترقی کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں سب بجا اور درست، لیکن آپ یہاں جس قسم کی قوم تیار کر رہے ہیں، اُس کے ہاتھوں مجھے خود پاکستان کا وجود خطرہ میں نظر آتا ہے۔ نہروں، پلوں، سڑکوں، منڈیوں، بینکوں، کارخانوں سے کہیں زیادہ اہمیت ان درس گاہوں کو حاصل ہوتی ہے جن میں نئی قوم زیرِ تعمیر ہوتی ہے۔ ان درسگاہوں میں جس قسم کی نسل پرورش پا رہی ہے، جب

وہ آگے بڑھ کر قوم بن جائے گی تو وہ تباہی مچا دے گی اور یہ ریلیں، سڑکیں، نہریں، سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ لیکن اسے انہوں نے ان سنی کر دیا، اور قوم اسی نہج پر تیار ہوتی رہی۔ یہ کچھ تو ہماری نئی نسل کے ساتھ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ جہاں تک ہماری سابقہ نسلوں کے بقیات کا تعلق ہے، جنہیں ہم مسلمانوں کی وہ قوم کہہ سکتے ہیں جو تقسیمِ ہند سے پہلے ہندوستان میں موجود تھی، اِن کے دل میں مذہب کی عقیدت بڑی پختگی سے پیوست ہے۔ اِن کی صورت میں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مذہب کا صحیح تصور کیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کا جو تصور بنیادی طور پر علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا، اور پھر قائداعظمؒ نے اس کا عام چرچا کیا، اس کی رُو سے اسلام ایک مذہب نہیں، الدّین ہے جس کے احاطہ میں دنیاوی زندگی کا ہر شعبہ آ جاتا ہے اور اِسی الدّین کو عملاً رائج کرنے کے لئے مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے ہندو نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا۔ اِس خطرہ کی روک تھام کے لئے اس نے سوچا یہ تھا کہ مذہب کا ایک ایسا مفہوم پیش کر دیا جائے جو مسلمانوں کے قدیم مذہب پرست طبقہ کے جذبات کی تسکین کا سامان تو فراہم کر دے، لیکن عملاً وہ ایک مطلوبہ قوم بن کر رہ جائے۔ اِس ضمن میں، پنڈت جواہر لال نہرو نے مشہور برہمو سماجی رہنما، شری کیشب چندر سین، کی صد سالہ برسی کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

> ہندوستان میں اسلام ایک غلط طریق پر آیا۔ بایں ہمہ اِن ہر دو متضاد تصوراتِ زندگی (اسلام اور ہندومت) میں امتزاج پیدا کرنے کے لئے ایک کو، دوسرے میں جذب کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ گورو نانک اور بھگت کبیر جیسی شخصیتوں اور اکبر جیسے بادشاہ کی کوششوں سے کافی ترقی کر گیا۔ اس کے بعد یہ کوششیں ماند پڑ گئیں لیکن یہ سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا، ایک بیرونی طاقت ہندوستان میں آ پہنچی۔ (پمفلٹ معرکۂ دین و وطن از پرویز۔ صـ۱۴)

تصوّف بطور سیاسی حربہ

یہ فروری ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ اسی سال ۲۶ مارچ کو دیوان لال چند نول رائے نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا:-

> تصوف ہی وہ ذریعہ ہے جس کی رو سے امید کی جا سکتی ہے کہ تمام اہلِ ہند قومیتِ واحدہ کے رشتہ میں پروئے جائیں گے اور یہی چیز ہندوستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے صحیح حل کی طرف

رہنمائی کر سکتی ہے۔ (ایضاً)

اسلام کے اس تصوّر (یعنی تصوّف) کے لئے سندھ کی سرزمین بڑی سازگار تھی، کیونکہ وہاں ہندوؤں نے اس سے بہت پہلے اِسے ایک تحریک کی شکل دے رکھی تھی۔ آپ کو یہ سُن کر شاید حیرت ہو کہ سندھ کے بڑے بڑے صوفیاء، فقراء اور سرمستوں کے مریدوں میں ہندوؤں کی تعداد بڑی کثیر تھی ـــــ اور ان کے مزارات اور خانقاہوں کی تولیت میں ان کا اثر غالب تھا۔ معلوم نہیں، اب وہاں کیا کیفیت ہے، لیکن اسلام کا یہی تصوّر ہے جو وہاں کی فضا پر عام طور پر مسلّط ہے۔ اور جی۔ ایم۔ سید، جو سندھ کی علیحدگی کے جراثیم عام کر رہے ہیں، وہاں اِسی اسلام کے احیاء یا فروغ کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ انہوں نے آج سے کچھ عرصہ پہلے سندھی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا اُردو ترجمہ "جیئا میں نے دیکھا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اُس میں، پہلے صحیح اسلام کے بنیادی مسلمات کی مخالفت اور تردید کی، بلکہ ان کا مذاق اُڑایا، اور اس کے بعد کہا کہ:-

> صحیح ترین تصوّرِ حیات، تصوف ہے۔ جس کا اہم اصول وحدتِ مذاہب ہے۔ تصوّف، عدم تشدد یا اہمتاء کا حامی ہے۔ وہ حق و صداقت پر کسی مخصوص گروہ کی اجارہ داری تصوّر نہیں کرتا۔ وہ کسی بھی مذہبی، اقتصادی اور سیاسی نظریہ کو حرفِ آخر جان کر اُس کی اندھی تقلید سے گریز کرتا ہے۔
>
> (صفحہ ۲۰۵۔ بحوالہ پمفلٹ معرکۂ دین و وطن۔ صفحہ ۲۲)

مسٹر سید نے اُس کتاب کے آخری صفحہ پر لکھا ہے:-

> صوفی، مذاہب و عقیدہ کی بنیاد پر قومیت استوار کرنے کے خلاف ہے، اور مذاہب کے موجودہ تعصبات کو درست نہیں سمجھتا ـــــ وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا حامی ہے۔
>
> (صفحہ ۲۰۷۔ بحوالہ پمفلٹ معرکۂ دین و وطن۔ صفحہ ۲۲)

تشکیلِ پاکستان کے بعد، پاکستان کے بنیادی نظریات کے خلاف یہ جراثیم سندھ کے خطۂ زمین تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اِسے عام کیا گیا اور بڑی شدّت سے پھیلایا گیا۔ جن حضرات نے تقسیمِ ہند کا زمانہ دیکھا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ اس وقت پاکستان میں مرجع خلائق، مزارات اور صوفیاء کی درسگاہیں موجود تو تھیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی، اور ان کے سلسلہ میں منائے جانے والی تقاریب اور ان میں شمولیت اختیار کرنے والے زائرین اتنے پُرہجوم نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اِس اٹھائیس سال کے عرصہ میں یہ

سلسلہ کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ اب ملک کی ساری فضا اِس سے معمور ہو چکی ہے۔ کوئی جگہ خالی نہیں جہاں ان مزارات کی نمود نہ کر دی گئی ہو، اور سال بھر میں کوئی دن ایسا نہیں آتا جب ان کے سلسلہ میں کوئی نہ کوئی تقریب نہ منائی جاتی ہو ـــــ عرس، میلے، قوالیاں، مشاعرے، مزارات کے غسل اور چادر چڑھانے کی تقاریب، نذر و نیاز کی دیگیں، چڑھاوے۔ قیمتی پتھروں کے فرش، مرصع چھتیں، چاندی اور سونے کے دروازے اور نہ معلوم کیا کیا، جن کا نہ اس سے پہلے کہیں وجود تھا نہ اس قدر نمود ـــــ اب یہ چیزیں یہاں کے عالمگیر مذہب کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت اور بھی قابلِ غور ہے کہ قوم کے نام نہاد ترقی پسند دانشور (یعنی کمیونسٹ) جو خدا اور رسول تک کے منکر اور اسلام کا مضحکہ اڑانے میں پیش پیش ہوتے ہیں، وہ بھی بڑے ذوق و شوق سے اِن تقاریب میں شامل ہوتے اور بڑے جوش و خروش سے ان میں حصّہ لیتے ہیں۔

کمیونسٹوں یا سوشلسٹوں کی ٹیکنیک یہ ہے کہ معاشرہ کے نوجوان طبقہ میں فحاشی، بداخلاق اور قانون شکنی کے رجحانات عام کرتے جائیں، تاکہ ملک میں ہر طرف خلفشار اور انتشار پھیل جائے۔ دوسری طرف مذہب پرست طبقہ کو ایسے مشاغل میں الجھاتے چلے جائیں، جن سے وہ عالمِ کردار سے یکسر بیگانہ ہو جائیں اور دنیاوی یا سیاسی امور میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیں۔ چونکہ یہ لوگ کسی اخلاقی قدر کے قائل ہی نہیں ہوتے اس لئے وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر حربہ اختیار کر لیتے اور ہر رنگ کا بہروپ بھر لیتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ کے منکر اور ملحد اور دہریہ ہونے کے باوجود "اہل اللہ" کی مجالس میں شریک ہوتے، صوفیاء کی تقاریب میں بھرپور حصہ لیتے۔ حتیٰ کہ عید میلاد النبیؐ کے سلسلہ میں منعقد شدہ مشاعروں میں نعتیں تک پڑھتے نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر جوش ملیح آبادی کو دیکھئے ..... وہ اپنے آپ کو کھلے بندوں خدا کا منکر کہتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے انہوں نے اپنے ماہنامہ "کلیم" کی کی ایک اشاعت (نومبر ۱۹۳۷ء) میں اپنے عقیدہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ:-

> عظیم الشان پیغمبروں کی (معاذ اللہ ـــــ طلوعِ اسلام) حسرت ناک تاریخیں اور ان کی ہلاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں، اور ہم سے صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔ مذہب کا بیان ہے کہ خدا نے انبیاءؑ کے ذریعہ نوعِ انسان کی اصلاح کرنی چاہی تھی، اور اس سلسلہ میں ہزاروں نہیں، لاکھوں انبیاءؑ مبعوث فرمائے تھے۔ مگر

اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس کا جواب مجھ سے طلب نہ فرمائیے۔ عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر ذرا اندازہ کر لیجئے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم کس راستہ پر گامزن ہے۔

خدا اور اس کے رسولوں کے متعلق یہ خیالات، اور اس کے باوجود، آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ محرم کی مجلسوں میں کس طرح جھوم جھوم کر مرثیے پڑھتے اور "اللھم صل علیٰ محمد و آل محمد" کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اپنے اسی ماہنامہ کی دسمبر ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں انہوں نے مذہب اور وطنیت کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

> اپنے آپ کو مسلم یا ہندو، پہلے اور ہندوستانی بعد میں کہنا، جغرافیائی صداقت اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے۔ لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی، قومیت تو ہمارا گوشت اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس تو ہر وقت بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت اور وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا، طاقتِ بشری سے باہر ہے۔

مذہب اور قومیت کے متعلق اس عقیدہ کے باوجود یہی شاعرِ انقلاب اُس مملکت کے زیرِ سایۂ عاطفت اُس کے مرکز میں بیٹھے پرورش پا رہے ہیں جو مذہب کے نام پر حاصل کی گئی ہے اور جس کے دستور تک میں یہ شق موجود ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہے۔ ان حضرات کی یہی ٹیکنیک ہے جس کی رو سے کیفیت یہ ہے کہ ایک طرف قوم کو مساواتِ محمدی اور اسلامی سوشلزم کا جھنجھنا دیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ:-

> ہم اپنی بقا کی جدوجہد سے آگے بڑھ کر اپنی سربلندی کی جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں، اور یہ آغاز اس لمحہ ہو رہا ہے جب سرزمینِ ایشیا میں ویت نام اور کمبوڈیا کے مجاہدوں نے وقت کے افق کو اپنے خون کی شعاعوں سے سرخ کر دیا ہے۔ جن ازلی دشمنوں سے ہمیں سابقہ ہے ان سے نپٹنے کا راستہ روشن ہو چکا ہے۔ یہ پیام دے رہی ہے مجھے بادِ صبح گاہی کہ اگر پاکستان کو جینا ہے اور سربلند ہو کر جینا ہے تو اسے ایشیا کے افق پر ابھری ہوئی سرخی سے اپنی مانگ بھرنی ہوگی، اور اس سرخی میں اضافہ کرنے کے لئے اپنے لہو میں نہانا ہوگا۔ آزادی اور انصاف کا یہ سورج تاریخ کی تاریکیوں سے ابھر تو آیا ہے، اب اسے جتنی جلدی ہم اپنی روحوں میں اتار لیں، اچھا ہے۔ جتنی جلدی پاکستان میں سوشلزم

آئے گا، اتنا ہی یہ سورج ہماری زمین سے ہم رشتہ ہوگا، اُتنی ہی یہ زمین پھول پھل لائے گی۔

یہ اعلان کسی پرائیویٹ شخصیت نے اپنی نجی محفل میں نہیں کیا۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے صاحب نے صوبائی پارلیمان کے اجلاس میں ۱۹۷۵-۷۶ء کا بجٹ پیش کرتے ہوئے بہانگِ دہل فرمایا۔ (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۵ر جون ۱۹۷۵ء) اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد قوم کو یہ دھمکی بھی دی کہ:۔

اگر اب اس سوشلزم کا راستہ روکا گیا، جس کے بارے میں ہم اسلام کے حوالے سے بات کرتے ہیں، تو پھر اس ملک میں کمیونزم آجائے گا۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۶ر اگست ۱۹۷۵ء)

بات "اسلام کے حوالے" سے کرتے ہیں، اور مانگ ہماری ایشیا سے نمودار ہونے والے سرخ سویرے سے مجرتے ہیں۔! جہاں تک "جمہوریت ہماری سیاست" کے منشوری دعویٰ کا تعلق ہے، اس کے متعلق کہا گیا کہ:۔

جمہوریت ہماری اصل منزل، سوشلزم کے حصول کے لئے پہلے پڑاؤ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوشلزم کے قائد یہ جانتے ہیں کہ سوشلزم کا انقلاب ہمیشہ دو منزلوں میں آیا کرتا ہے۔ پہلا مرحلہ قومی سطح پر جمہوری انقلاب مکمل کرنا ہوتا ہے اور دوسرا مرحلہ سوشلسٹ انقلاب ہے۔ سوشلسٹ انقلاب کبھی پہلے مرحلہ پر نہیں آتا۔ (ایضاً)

اس قسم کے خیالات کے عام کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کا نظریہ جو اسلام ہی کے احیاء کا دوسرا نام تھا، دھول بن کر اڑ چکا ہے، اگرچہ قوم کو دھوکہ دینے کے لئے نظریۂ پاکستان اور اسلام کے الفاظ بھی برابر دہرائے جاتے ہیں۔

وجودِ پاکستان کی عمارت کا دوسرا ستون یہ تھا کہ مسلم قومیت کی بنیاد دین کی وحدت ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ اور دین کی وحدت کا اوّلین مفہوم یہ ہے کہ مسلمان، مختلف قومیتوں میں نہیں بٹ سکتے۔ اِس نظریہ کی بنا پر، اور کچھ نہیں تو کم از کم، مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو ایک مستقل قوم قرار دیا جانا ضروری تھا۔ وحدتِ دین کو بھی چھوڑیئے — کم از کم وحدتِ وطنیت کی بنا پر بھی یہاں کے باشندوں کو ایک قوم تسلیم کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن یہاں ایک اور سازش کی گئی۔ مشہور روسی مصنف گانکوفسکی نے اپنی تصانیف "تاریخ پاکستان" اور "پاکستان کے عوام" میں اس تصور کو پیش کیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں، متعدد قومیں بستی ہیں۔ اس تصور کو عام کرنے کے لئے ۱۹۶۵ء میں کراچی میں "عوامی ادبی انجمن" کے نام سے ایک تنظیم ظہور

چار قومیتیں

میں آئی۔ اس کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا، جس پر منجملہ دیگر "دانشورانِ قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس میں کہا گیا تھا۔

> ہمارے نزدیک اس جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں، جو مختلف قوموں کا وطن ہے، وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں، ان کی زبانیں اور تہذیبیں، کسی ایک قوم کے اثر اور تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں۔ اس لئے ہم ادیب تمام قوموں کے لئے یکساں داخلی خود مختاری اور ان کی زبانوں کے لئے تعلیم، دفتر اور ملازمتوں کی زبان بننے کا حق چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔
> (طلوعِ اسلام۔ مئی ۱۹۷۲ء۔ صفحہ ۲۲)

ان حضرات کی جرأتیں کس قدر بے باک ہو گئی ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے قائداعظمؒ کے یومِ پیدائش کی تقریب مختلف تنظیموں کے زیرِ اہتمام منائی جاتی تھی۔ اب دو تین سال ادھر سے خود حکومت کے زیرِ اہتمام قائداعظمؒ کا یومِ پیدائش ہی نہیں، پیدائش کا ہفتہ منایا جاتا ہے۔ امسال یہ تقریب ۳، ۴، ۵ جنوری ۱۹۷۵ء کو سیمینار کی شکل میں اسمبلی ہال لاہور میں منائی گئی۔ اس تقریب میں کس کس قسم کے نظریات کی نشر و اشاعت کی گئی اس کی ایک جھلک فیض صاحب کی اس تقریر سے سامنے آ جاتی ہے جو انہوں نے ۴ جنوری ۱۹۷۵ء کے اجلاس میں فرمائی اور جو نوائے وقت لاہور اور پاکستان ٹائمز لاہور کی ۵ جنوری کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے "قومی تشخص کی تلاش" کے موضوع پر (بزعمِ خویش) تحقیق کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے دوران دو قومی نظریہ کا ذکر کیا۔ اور کہا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد اس نظریہ کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ اور اس کے بعد فرمایا:۔

> حصولِ پاکستان کے بعد خود قائداعظمؒ کے سامنے بھی دو قومی نظریہ کا تصور باقی نہیں رہا تھا۔ (کتنی بڑی ہے یہ جسارت!......) لیکن کچھ لوگوں نے اپنے مقاصد کے تحت اس نظریہ کو باقی رکھا۔ بہرحال پاکستانی قوم کا تشخص وہی ہے جو قائداعظمؒ نے دیا تھا کہ وہ دھرتی جس کا نام پاکستان ہے، وہاں جو بھی رہتا ہے وہ پاکستانی قوم کا فرد ہے۔ اور یہی دھرتی قومیت ہے۔

یہاں سے کم از کم یہ مترشح ہوتا ہے کہ وطنیت کی بنیادوں ہی پر سہی، فیض صاحب نے مغربی پاکستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم تو تسلیم کر لیا۔ لیکن نہیں! اسی تقریر کے

اگلے چند فقرے بھی سُن لیجئے۔ فرمایا:۔

> سرزمین اور فرد کے مرکب کا نام پاکستان ہے۔ اس لئے پہلے تو ہر آدمی کے دل میں اپنے گاؤں اور علاقہ کی محبت پیدا کی جائے۔ لیکن ایک دائرے کے اندر رہ کر ـــــ اور اس دائرے کے اندر تہذیب و ثقافت اور دوسری علاقائی خصوصیات کو اجاگر کیا جائے۔ اس طرح جو چیز اُبھرے گی وہ پاکستان ہوگا۔ (طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۷۵ء۔ صـ۶)

آپ نے غور فرمایا کہ مغربی پاکستان میں بھی علاقائی بنیادوں پر مختلف قومیتوں کے تصور کو کس طرح اجاگر کیا جا رہا ہے۔ فیض صاحب اسلام آباد ہی میں فروکش ہیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ حکومت کے ذرائع ابلاغ ـــــ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور حکومتی زیرِ اثر پریس ان کی زیرِ ہدایت مختلف قومیتوں کے نظریہ کے عام کرنے میں سرگرم عمل ہے ـــــ علاقائی زبانوں کا فروغ، لوک گیت، ثقافت کے نام سے علاقائی امتیازات کی عام نمائش، علاقائی میلے ٹھیلے، صوبائی فقیروں کے کلام کی عام نشر و اشاعت۔ اِسی نظریہ کے عام کرنے کی مسلسل جدوجہد ہے۔ پریس اس باب میں کیا خدمت انجام دے رہا ہے، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگائیے۔ گذشتہ یومِ آزادی کی تقریب پر برسرِ اقتدار پارٹی کے سندھی روزنامہ "ہلالِ پاکستان" نے بھی خاص نمبر نکالا، اس میں ایک طویل مقالہ شائع ہوا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ ایک لادینی ملک چاہتے تھے اور قیامِ پاکستان کا مطلب نظریاتی مملکت قائم کرنا نہیں بلکہ سیکولر پاکستان تھا۔ اس پر مقالہ نگار نے لکھا کہ:۔

> نظریۂ پاکستان کا نعرہ ملک کے دو حصّوں کو جمع نہ رکھ سکتا تھا۔ پھر بھی نظریاتی مملکت کے مطالبات کئے جا رہے ہیں..... نظریۂ پاکستان یا ایک مذہبی مملکت کا نظریہ نہ صرف تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کرتا ہے، بلکہ گھٹیا سوچ بھی پیدا کرتا ہے۔
>
> (بحوالہ ہفتہ وار ایشیا لاہور۔ بابت ۳۱ر اگست ۱۹۷۵ء)

مقالہ نگار کا دستِ بے باک، گریبانِ قائدِاعظمؒ تک بھی جا پہنچا۔ اور اس نے لکھا کہ:۔

> پاکستان میں اسلامزم والے نظریہ اور نظریاتی ملک کی تردید کتنے ہی مواقع پر قائدِاعظمؒ نے خود کی تھی..... پاکستان کی جد و جہد جیسے جیسے بڑھتی گئی ویسے ویسے قائدِاعظمؒ پاکستان کا صحیح تصور پیش کرنے لگے۔ اور سیکولرازم اور لادینیت پر زور دینے لگے۔ (ایضاً)

آپ غور فرمائیے کہ پاکستان میں بیٹھ کر، بانیٔ پاکستان کے خلاف اس قدر کھلی ہوئی افترا پردازی

اور الزام تراشی کی جرأت، کس قسم کی سازشوں کی غماز ہے؟

چلتے چلتے ایک اور بات بھی ذہن میں رکھئے۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ قائدِاعظمؒ کے یومِ پیدائش کی تقریب میں کس قسم کے خیالات پیش کئے جاتے ہیں۔

جشنِ پیدائشِ قائدِاعظمؒ

اب حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ۱۹۷۶ء میں قائدِاعظمؒ کے یومِ پیدائش کا صدسالہ جشن منایا جائے گا۔ اور اس سلسلہ میں تحریکِ پاکستان کی تاریخ اور بانیٔ پاکستان کے سوانح حیات مرتب و مدون کر کے کتابی شکل میں پیش کئے جائیں گے۔ یہ خدمت بھی فیض احمد فیض اور اُن کے اس انداز کے ہم نواؤں کے سپرد کی جا رہی ہے جن کی فکر اور زاویۂ نگاہ کا نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ، آئندہ سال کے مجوزہ جشن کی تقریب پر تحریکِ پاکستان اور حیاتِ قائدِاعظمؒ کو کس رنگ میں پیش کیا جائے گا۔

ڈھاکہ کے طالب علم عزیز الرحمٰن کو اُس خط کو ایک بار پھر سامنے لائیے، جس کا اقتباس پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کے آخر میں اُس نے کہا تھا کہ یہی خیالات اب سندھ میں بھی عام ہو رہے ہیں۔ سندھ میں یہ سازشیں کس طرح رو بہ عمل ہیں، ان کی تفصیلات بہت کم سامنے آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو کچھ سامنے آتا ہے اُس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ وہاں کی ہواؤں کا رُخ کس سمت کو ہے۔ اس اجمال کی تفاصیل گذشتہ دو تین برس سے طلوعِ اسلام کی مختلف اشاعتوں میں مسلسل پیش کی جا رہی ہیں۔ یہاں اُن میں سے صرف ایک مثال کا دہرا دینا کافی ہوگا۔ وہاں "جئے سندھ متحدہ محاذ" کے صدر مسٹر جی ایم سید نے ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو سندھ یونیورسٹی میں "سندھی شام" کے موقع پر ایک تقریر کی تھی۔ جس میں انھوں نے اپنے تمام نظریات ایک ایک کر کے پیش کئے تھے۔ مثلاً انہوں نے کہا تھا کہ سندھی قوم پرستی کے بنیادی اجزا حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) سندھ کے جداگانہ ملک ہونے میں یقین رکھنا۔

(۲) پاکستان ایک ملک نہیں بلکہ چار جداگانہ ملکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں یقین رکھنا۔

(۳) سندھی، وطن، زبان، کلچر، تاریخی روایات، سیاسی اور اقتصادی مفاد کی بنیادوں پر جداگانہ قوم ہے۔

(۴) سندھی قوم جداگانہ حیثیت میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق انہوں نے کہا کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں ــــ "جو

لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو بیوقوف ہیں یا دھوکہ باز" اس کے بعد انہوں نے کہا کہ سندھیوں کے پاس ہر آنے والی حکومت کی پالیسی کو جانچنے کے لئے کچھ معیار ہونے چاہئیں، جن کے مطابق غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جاسکے۔ میری نظر میں وہ معیار یہ ہیں۔

(۱) نظریۂ پاکستان میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھیوں کو کبھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

(۲) مضبوط مرکز میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھ کی دشمن ہے۔

(۳) اسلامی آئین یا اسلامی حکومت پر یقین رکھنے والی حکومت سندھ کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔

(۴) سندھیوں کی جداگانہ قوم اور سندھو دیش سے انکار کرنے والی حکومت سندھ دشمن شمار کی جاسکتی ہے۔

(طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۷۳ء)

یہ ۱۹۷۳ء کی بات تھی۔ حال ہی میں "جیئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن" کے صدر مسٹر ضمیر [illegible] کا ایک انٹرویو ہفتہ وار "اداکار" لاہور کی ۳۱ اگست تا ۶ ستمبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک سوال کے جواب میں اُس نے کہا کہ:-

شیخ مجیب علیحدگی نہیں چاہتا تھا، لیکن اُسے علیحدگی کے لئے مجبور کر دیا گیا۔ اسی طرح اگر ہمیں مجبور کیا گیا تو ہم بھی علیحدہ ہو جائیں گے۔

یہ ہیں وہ ہوائیں جو مغربی پاکستان میں کئی برسوں سے چل رہی ہیں۔ میں نے بلوچستان اور صوبۂ سرحد کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ ان سطور کی تحریر کے وقت ان صوبوں کے رہنماؤں کے خلاف مقدمہ سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت ہے، اس لئے ان کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ کہنا قانوناً ممنوع ہے۔

خطۂ پنجاب کی حالت

باقی رہا پنجاب، تو یہاں کے حالات سب سے زیادہ یاس انگیز اور عبرت آموز ہیں۔ یہاں کے پرانے لوگ، جو اس خطۂ زمین کی درخشندہ روایات کے حامل تھے، مسلسل غنڈہ گردی اور قانون شکنی سے اس قدر خائف ہو چکے ہیں کہ وہ ڈرے، سہمے، کونوں کھدروں میں چھپے زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ اور جس کے دن اس طرح سے گزر جائیں — وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہے، ورنہ یہاں تو کوئی شریف انسان، اپنی کسی متاعِ حیات کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ باقی رہی یہاں کی نئی نسل جو نوجوان طالب علموں پر مشتمل ہے، سو ان میں سے کچھ تو سوشلسٹوں کے زیر اثر ہر اخلاقی قدر سے بے باکی میں فخر محسوس کرنے لگ گئے ہیں۔ طالب علموں کا دوسرا گروہ جماعتِ اسلامی کے زیرِ اثر ہے، جس نے انہیں اور ہی ڈھرے پر لگا دیا ہے۔ ان طالب علموں کا اسلام کے متعلق ذاتی علم کچھ نہیں ہوتا۔

ان کے ذہن میں مودودی صاحب کی شخصیت کو اتنا بڑھا چڑھا کر راسخ کر دیا گیا ہے کہ وہ ان کے ہر قول کو وحیٔ منزل من اللہ کی طرح واجب التسلیم قرار دیتے ہیں ــــ مودودی صاحب کو امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا ہم پایہ، مزاج شناسِ رسولؐ، حتیٰ کہ اللہ کا شاہکار بنا دیا گیا ہے۔ اُدھر مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا اسلام، ان کی مصلحتوں کے تابع، جسے وہ حکمتِ عملی کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ انہوں نے ان نوجوانوں کو تعلیم یہ دی ہے کہ جماعت سازی کے سلسلہ میں بڑے بلند آہنگ اور مقدس اصول پیش کرنے چاہئیں۔ لیکن جب ان پر عمل کرنے کا وقت آئے تو انہیں بالائے طاق رکھ کر حکمتِ عملی سے کام لینا چاہیئے ــــ اور قیامت یہ کہ انہیں بتایا یہ گیا ہے کہ (معاذ اللہ) خود رسول اللہ کا بھی یہی مسلک تھا۔

انہیں تعلیم یہ دی گئی ہے کہ زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ایسے مواقع پر جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے۔

انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اپنے مخالف کو قتل کرنے کے لئے جھوٹ اور فریب سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ (معاذ اللہ) ایسا خود رسول اللہ نے بھی کیا تھا۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ انتخابات میں حصہ لینا قطعاً ناجائز ہے اور دوسرے وقت میں اسے عین مطابقِ اسلام بتایا جاتا ہے۔

ایک وقت کہا جاتا ہے کہ عورت سیاسی امور میں قطعاً حصہ نہیں لے سکتی، اور دوسرے وقت میں مملکت کے منصبِ صدارت تک کے لئے عورت کے انتخاب کی پُرزور حمایت کی جاتی ہے۔ ایک وقت کہا جاتا ہے کہ زمین اور دیگر ذرائع پیداوار، یا دولت اور جائداد کی ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی حدبندی عائد نہیں کی جا سکتی اور دوسرے وقت میں خود ہی ان کی حدبندی کی تجویز کی جاتی ہے۔ ایک وقت کہا جاتا ہے کہ نیشنلائزیشن بدترین نظام ہے جسے ابلیس ایجاد کر سکا ہے اور دوسرے وقت میں اسی کی خود ہی سفارش کی جاتی ہے۔ ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ مجالسِ قانون ساز میں پارٹیاں بنانا قطعاً ممنوع ہے اور دوسرے وقت میں اپنے ارکان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ پارلیمان میں اپنی پارٹی قائم کریں۔ ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ امیر، جماعت کے مشورہ کا پابند نہیں۔ اُسے مشورہ کے خلاف "ویٹو" کا حق حاصل ہے۔ اور دوسرے وقت میں صدارتی نظام کی اس بنا پر مخالفت کی جاتی ہے کہ اس میں صدر کو "ویٹو" کا حق حاصل ہوتا ہے جو خلافِ اسلام ہے۔ ایک وقت میں وکالت کے پیشے کو حرام قرار دیا جاتا ہے اور دوسرے وقت میں وکلاء کو امام ابوحنیفہؒ وغیرہ کے منصب کا وارث ٹھہرایا جاتا ہے۔

یہ ہے نمونہ اس تعلیم کا جو ان سادہ لوح نوجوانوں کو دی جاتی ہے۔ آپ غور سے دیکھیں گے

تو آپ کو صاف نظر آ جائے گا کہ اِس میں اور کمیونسٹوں کے مسلک میں کوئی بھی فرق نہیں ـــــ فرق ہے تو بس اتنا کہ کسی مسلمان کمیونسٹ کے دل میں ممکن ہے کبھی تنہائی میں یہ خیال اُبھر آئے کہ جھوٹ، فریب اور تضاد کی یہ روش صحیح نہیں ہے۔ لیکن جماعتِ اسلامی کے تربیت دادہ نوجوانوں کے دل میں اس قسم کا خیال کبھی نہیں اُبھر سکتا کیونکہ انہیں اس کا یقین دلا دیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ (معاذ اللہ) خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا ثواب کا موجب۔

عزیزانِ من! آپ خود فرمائیے کہ یہاں کس قسم کی قوم تیار کی جا رہی ہے۔ قوم کے بڑے بوڑھے جن کے دل میں اسلامی اقدار و احکام کی عزت و توقیر تھی، ان میں سے بیشتر دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد ملّتِ پاکستانیہ، کلیتہً انہی نوجوانوں پر مشتمل ہوگی، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ مستقبل قریب ہی میں اس ملک کا حشر کیا ہونے والا ہے؛ جیسا کہ میں بار بار اعلان کرتا چلا آ رہا ہوں، میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ میں نے عملی سیاسیات میں قدم ہی نہیں رکھا۔ میں نے تحریکِ پاکستان کی امکان بھر تائید کی تو اس یقین کی بنیادوں پر کہ اس سے ایک ایسا قطعۂ زمین حاصل ہو جائے گا جس میں قرآنی نظام کے احیاء اور تمکن کا امکان ہوگا۔ یہاں آنے کے بعد میں گذشتہ اٹھائیس سال سے مسلسل اس پکار کو دہراتے جا رہا ہوں تو اس لئے کہ یہ میرے ایمان کا تقاضا ہے۔ میرے پاس وہ ساز و سامان نہیں جس سے میں اِس دینی تقاضہ کو ملک کا عملی دستور اور نظام بنا دوں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، اُس مقصد کے حصول کے لئے، جس کی خاطر یہ مملکت وجود میں لائی گئی تھی، صرف ایک طریقہ تھا اور وہ یہ کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں کہ قرآنی اقدار کی پابندی ان کی زندگی کا تقاضہ بن جائے۔ ہم نے اس سے تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اُس مقام پر آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں قوم اپنے مستقبل کی طرف سے قطعاً مایوس ہو رہی ہے۔ اس کے مستقبل کے تصور سے لرزاں و ترساں تو ہر قلبِ حساس ہے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ مقامِ تاسف یہ ہے کہ یہ احساس نہ اربابِ سیاست کے ذہنوں میں نظر آتا ہے اور نہ اقامتِ دین کے مدعیوں کے قلب میں ـــــ ان میں سے ـــــ ہر گروہ کو ہے بردۂ معصوم کی تلاش۔

سرسید کے زمانے میں بھی قوم، تباہی کے اسی جہنم کے کنارے پہنچ چکی تھی، لیکن جب اُس محسنِ ملّت نے یہ سوچا کہ اس کا علاج تعلیم ہے، اور وہ اس تصور کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے اٹھا تو اُس دور کی غلامی اس کے راستے میں مزاحم نہیں ہوئی۔ لیکن

وائے بر حالِ ما، کہ ہمارے دورِ آزادی میں اس کا بھی امکان نہیں رہا۔ اسکولوں اور کالجوں کی نیشنلائیزیشن اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی شخص یا ادارہ، صحیح اسلامی تصور کی آزاد درسگاہ قائم کر سکے، جس میں محدود پیمانے پر ہی سہی، اس بلند نصب العین کو نوجوانوں کی زندگی کا نصب العین بنایا جا سکے، جسے قرآن نے متعین کیا تھا اور جس کے حصول کے لئے یہ مملکت وجود میں لائی گئی تھی۔ ایک ایسی درسگاہ کے قیام کی میری اسکیم بھی اسی گرداب میں ہچکولے کھا رہی ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! اس خواب کی تعبیر جسے آج سے پینتالیس سال پہلے، حکیم الامت کی نگہ جہاں بیں نے دیکھا اور بانیٔ پاکستان کی فراست نے جہانِ نو کی شکل میں پیش کیا تھا۔ اس خواب اور اس کی تعبیر کی طول و طویل داستان کو اقبال نے ایک مصرعہ میں جس ایجاز و اعجاز سے سمو دیا ہے، یقین مانئے کہ میں جوں جوں اس پر غور کرتا ہوں، سوچوں کے سمندر میں ڈوب جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اس داستان کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ ــــ خوابم زیاد رفتہ و تعبیرم آمدہ است۔ میں نے ایک خواب دیکھا تھا جو یکسر بھول گیا۔ لیکن میں ہر ایک سے پوچھتا پھرتا ہوں کہ اس کی تعبیر کیا ہے؟ ایک بھولے ہوئے خواب کی تعبیر کی آمد، یہ ہے ہمارا حاصلِ حیات!

لیکن مجھے، عزیزانِ من! نہ وہ خواب بھولا ہے، نہ ہی میں اس کی تعبیر کی طرف سے مایوس ہوں۔ امید نہ تو وقت کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے، نہ ہی اسے پیمانۂ امروز و فردا سے ماپا جاتا ہے۔ یہ تو زندگی کی جوئے رواں کی طرح، جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو دایۂ فطرت نے انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ بند کر دیا ہے، نہ ہی قرآن کی نور افشانیوں کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے اگر آج کا انسان اس قندیلِ آسمانی سے اپنی زندگی کے راستوں کو روشن نہیں کرنا چاہتا تو نہ سہی۔ کل کو آنے والے انسان اسے دلیلِ راہ بنائیں گے۔ اس کتابِ عظیم کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسی دور کا انسان بھی روشنی کی طرف سے مایوس نہ ہونے پائے۔ لہٰذا جب تک قرآن باقی ہے۔ (اور یہ ابد تک باقی رہے گا) اس وقت تک امید باقی ہے۔ کس قدر حسین اور شگفتہ انداز میں کہہ گیا ہے بات کہنے والا کہ ؎

از صد سخن پیرم، یک حرف مرا یاد است عالم نشود ویراں، تا میکدہ آباد است

اور یہی وہ حرفِ دلآویز ہے جسے میں بھی دھرائے چلا جا رہا ہوں ؎

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہوگا

قرآن کریم نے ایمان بالآخرت پر جو اس قدر زور دیا ہے تو اس سے مقصد یہی ہے کہ اگر آج کا دور تمہارے مقاصد کے لئے سازگار نہیں تو مایوس نہ ہو۔ اپنی نگاہ مستقبل پر رکھو۔ یہی مستقبل پر ایمان ہے، عزیزانِ من! جو مجھے کبھی مایوس نہیں ہونے دیتا ــــ لہٰذا ؎ نجوم بجھتے رہیں، تیرگی اُمنڈتی رہے ــــ مگر یقینِ سحر ہے جنہیں اداس نہیں

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۹) والسلام

شاہکارِ رسالت

عمر فاروقؓ

(اپنے انداز کی منفرد کتاب)

اکثر سوالات اُبھرتے ہیں کہ :-

- اسلام کا معاشرتی ، تمدنی ، عسکری ، سیاسی ، معاشی نظام کیا ہے؟
- کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم بھی ہوا تھا ؟
- اگر قائم ہوا تھا تو کب ؟ اور اس کا انداز کیا تھا ؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ :-

- اگر یہ نظام قائم ہوا تھا ، تو پھر آگے کیوں نہ چلا ؟
- وہ نظام (یعنی دین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا ؟
- عجمی سازش سے کیا مراد ہے ؟
- اب صحیح اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے ؟

ان سوالات کا نہایت مدلل ، مستند ، معقول ، اطمینان بخش جواب اس کتاب میں ملے گا ـــــ جو مفکرِ قرآن جناب پرویز صاحب کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوش اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

نیز اس میں فقہ ، حدیث ، امامت ، تصوف ، کشف و الہام ، دعوائے ماموریت اور ختم نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے۔

بڑے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر مشتمل تصنیف ، سفید کاغذ ، مضبوط جلد ، جاذبِ نگاہ گرد پوش۔ قیمت -/۴۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور